ماہنامہ **محدّث** بنارس

شمارہ/ ۷	جمادی الآخرہ ۱۴۲۹ھ	جولائی ۲۰۰۸ء	جلد/ ۲۶

اس شمارہ میں

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱جی، ریوڑی تالاب

وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک

سالانہ ۱۲۰/ روپے

فی پرچہ ۱۲/ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

www.aljamiatussalafiah.org

E-mail: jamia@aljamiatussalafiah.org / secretary@aljamiatussalafiah.org

درس قرآن

ہدایت کا راستہ

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ (البقرۃ:۳۸-۳۹)

ہم نے (آدم وحوا سے) کہا، تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت کریمہ سے بالکل صاف اور واضح ہے کہ ہدایت کا راستہ، صحیح مذہب اور دین، پرسکون طرز زندگی، کامرانی اور سرخ روئی کا معاشرہ وہی ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ سے انسان کے لئے بھیجا گیا ہے۔

اپنا بنایا ہوا طریقہ یا مذہب، سنتوں اور صوفیوں کی من گھڑت باتیں اور عبادت کا ہر وہ طریقہ جو اللہ کی طرف سے نہ ہو فلاح اور کامیابی کا راستہ نہیں ہوسکتا۔

اللہ کے دین کو تسلیم کرنا، اس پر یقین رکھنا اور اس کی تابعداری کرنا ہر انسان پر فرض ہے، اور جو انسان اس کے بھیجے ہوئے دین اور احکامات کو نہیں مانے گا اس کے لئے اللہ نے جہنم کی آگ تیار کر رکھا ہے۔

ہر دور میں اللہ نے اپنے احکامات کو انسان تک پہنچانے کے لئے نبی ورسول بھیجا، یہ سلسلہ اس کے آخری رسول محمد ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اللہ نے محمد ﷺ کے ذریعہ انسانوں کے لئے جو دین بھیجا ہے اب یہی ہدایت کا راستہ ہے۔ ہم کو چاہئے آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنائیں اور اس کی خلاف ورزی سے بچیں، اسی میں ہماری نجات اور ابدی کامیابی ہے۔

اللہ تعالی ہم کو اس کی توفیق بخشے، آمین۔

☆☆☆

درس حدیث:۱۱۵

امام ومقتدی کی جائے قیام

تحریر: مولانا عبدالسلام مدنی / استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن جابر، قال: قام رسول الله ﷺ ليصلى، فجئت حتى قمت عن يساره، فأخذ بيدى فأدارنى حتى أقامنى عن يمينه، ثم جاء جبار بن صخر، فقام عن يسار رسول الله ﷺ، فأخذ بيدينا جميعا، فدفعنا حتى أقامنا خلفه. رواه مسلم. (مشكاة ج ١، ص ٩٩)

قال صاحب المرعاةؒ: رواه مسلم فى آخر صحيحه فى أثناء الحديث الطويل ...... (مرعاة ج ٤، ص ٢٨)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے، پھر میں آیا اور آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا، آپ ﷺ نے میرا (داہنا) ہاتھ پکڑا اور (پیچھے سے) گھما کر اپنے داہنے کھڑا کرلیا، پھر جبار بن صخرؓ آئے اور آپ کے بائیں کھڑے ہوگئے، آپ ﷺ نے ہم دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ پکڑ کر اپنے پیچھے ہٹایا اور پس پشت کھڑا کردیا۔ (مسلم شریف)

تشریح: حدیث پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز ادا کرتے ہوئے امام اور مقتدی کیسے کھڑے ہوں، اگر دو ہی فرد ہوں تو امام بائیں جانب اور مقتدی داہنی طرف رہے، اس کے برعکس کھڑے ہونے پر امام مقتدی کو نماز ہی کی حالت میں گھما کر صحیح طور پر کھڑا کرلے، اور اگر درمیان صلاۃ ہی تیسرا فرد آکر امام کے بائیں کھڑا ہوجائے اور مقتدی حضرات کے لئے امام کے پیچھے جگہ ہو تو دونوں کو ہاتھ پکڑ کر پیچھے کردے۔

اور اگر نماز شروع کرتے وقت ہی تین فرد یا اس سے زائد ہوں تو امام آگے کھڑا ہو اور مقتدی حضرات اس کے پیچھے صف لگائیں جیسا کہ صحیح مسلم شریف کی روایت میں ہے، حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: "صليت أنا ويتيم فى بيتنا خلف النبى ﷺ وأم سليم خلفنا – رواه مسلم " (مرعاۃ ج ۴، ص ۳۰) یعنی "میں نے اور ایک یتیم بچہ نے اپنے گھر میں نبی ﷺ کے پیچھے صف لگا کر نماز پڑھی اور ام سلیمؓ نے ہم دونوں کے پیچھے نماز ادا کی"۔ (مسلم شریف)

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت پر نمازی کو آگے پیچھے کیا جاسکتا ہے۔ بنابریں اگر نماز باجماعت ہوتے ہوئے کوئی مصلی آئے اور اسے صف میں جگہ نہ ملے تو بآسانی اپنے سامنے سے کسی کو پیچھے کرکے صف لگالے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بقیہ حضرات خالی جگہ پُر کرلیں گے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے، آپ ﷺ نے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے: "فأمره أن يعيد الصلاة" رواه أحمد والترمذى ...... وقال الحافظ فى الفتح: صححه أحمد وابن خزيمة وغيرهما ...... (مرعاة ج ٤، ص ٢٤)، (احمد، ترمذی، ابوداود، حدیث صحیح ہے)

صاحب مرعاۃ فرماتے ہیں: والقول الأول هو الحق يدل عليه حديث وابصة، وهو حديث صحيح ...... (مرعاۃ ج ۴، ص ۲۲) یعنی صف کے پیچھے تنہا نماز ادا کرنا صحیح نہیں ہے، اور وابصہ والی روایت صحیح ہے......

رب العالمین! ہمیں کتاب وسنت کا علم عنایت فرما اور عالم باعمل بنا، آمین۔ ☆☆☆

افتتاحیہ

اچھی سیرت سے دین کی اشاعت

اسلام کی دعوت دینے والوں کی اچھی سیرت اچھے کام اور اچھی باتیں اشاعت دین کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، لوگ انہیں اسلام کے معانی سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، صرف گفتگو کے مقابل داعی کے اچھے کاموں سے لوگوں کا تاثر زیادہ اور قوی ہوتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ ساری دنیا میں اور دنیا کی ہر قوم میں دین اسلام اچھی سیرت و کردار کے ذریعہ زیادہ مقبول ہوا ہے، دنیا کے بے شمار ملکوں میں مسلمان تاجروں کے بہتر اعمال واخلاق سے وہاں کے مقامی لوگوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے۔

خود ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ سیرت و کردار کے نہایت اعلی نمونہ تھے، کتنے لوگ آپ کا چہرۂ مبارک دیکھ کر بے ساختہ کہہ دیتے تھے کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا، غار حراء میں جبریل امین سے ملاقات اور اولین نزول وحی قرآن کے بعد آپ ﷺ پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی کہ آپ نے جان جانے کا خوف ظاہر کیا، اس موقع پر مومنوں کی ماں خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے آپ کو سچا مانا، آپ پر ایمان لائیں اور دعوت دین کی راہ میں تعاون کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں لگا دیں، اس موقع پر انہوں نے نبی ﷺ کی سیرت طیبہ کا حوالہ دیا اور کہا آپ تو خونی رشتے جوڑتے، یتیموں بیواؤں کی خدمت کرتے، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، اللہ تعالی ہرگز آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔

اچھی سیرت کے لئے دو باتیں بنیادی ہیں: (۱) اچھے اخلاق وعادات (۲) بات اور کام میں یک رنگی، کسی داعی میں یہ دوخوبیاں پیدا ہو جائیں تو اس کی سیرت بے شبہ اچھی سیرت کہی جائے گی، جو اسلام کی خاموش داعی ہوگی اور اگر کوئی داعی ان دونوں خوبیوں سے خالی ہو تو اس کی سیرت بری سیرت کہلائے گی اور خاموش طور پر لوگوں کو اسلام سے دور کرے گی، لہذا داعی کو اللہ سے ڈرنا چاہیئے کہ زبان سے وہ جس اسلام کی دعوت دے رہا ہے، اپنی بری سیرت سے وہ لوگوں کو اسلام سے دور کر رہا ہے۔

دعوت کا کام کرنے والے حضرات کو اسلام کے فضائل اخلاق کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اپنے دل ودماغ میں زندہ وپائندہ علم کی طرح ان کا استحضار رکھنا چاہیئے، وہ مجرد علم نہیں بلکہ اچھے اخلاق ایک اچھے مومن وداعی کی زندگی کا ایندھن ہیں، ان

کے بغیر ایک صالح اسلامی زندگی کی گاڑی سیدھے راستے پر چل نہیں سکتی، اس سلسلہ میں صبر اور عفو ودرگذر جیسی بلند عادات واخلاق کی مضبوط پابندی داعی کے لئے طاقت ورفوج کی حیثیت رکھتی ہے، دیکھئے اکبرالہ آبادی جیسے جدید دور کے چوٹی کے انسان حسن اخلاق کے متعلق کس قدر سنجیدہ ہیں وہ کہتے ہیں:

خدا کی یاد ہے طاقت ہماری — مصلیٰ ہے ہمارا تخت شاہی
ہماری فوج ہے اخلاق حسنہ — ہمارا حصن ہے ترک مناہی
بلند اپنی نظر ہے فضل حق سے — کرے گی کیا کسی کی کم نگاہی

داعی اگر تبلیغ اسلام کی راہ میں صبر اور عفو ودرگذر کے حسین جوہر سے خالی ہوگا تو جتنی اصلاح کرے گا اس سے کہیں زیادہ فساد اور بگاڑ پیدا کردے گا، یہی وجہ ہے کہ خود ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ کو جب اللہ تعالی نے آسمانی رسالت کو دنیا والوں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی تو تاکید فرمائی: ﴿ولربك فاصبر﴾ (المدثر:۷) اورآپ اپنے رب کے لئے صبر کریں۔اورعفو ودرگذر کے بارے میں فرمایا: ﴿خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين﴾ (۱۹۹/۷) آپ درگذر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجائیں۔

اس لئے کہ دنیاوی کاموں کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر داعی کو تبلیغ اسلام کی راہ میں مخالفت، تنگی اور اذیت کا سامنا ہوا کرتا ہے اور اچھے اخلاق اور صبر وعفو ہی سے اشاعت اسلام کی شاہراہ کھلا کرتی ہے۔

پھر جہاں تک قول وعمل میں یک رنگی کی بات ہے تو داعی کو یہ جوہر اخلاق لوگوں کی نظر میں ایک بہترین نمونہ بنادیتا ہے جس سے لوگ طبعا اس کی طرف کھینچتے ہیں اور ایسے لوگوں سے دور بھاگتے ہیں جن کے کام اور بات میں دورنگی ہوتی ہے، اس لئے قرآن مجید میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿يا أيها الذين آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون، كبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون﴾ (۶۱/۳) اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالی کو سخت ناپسند ہے۔

اگر داعی کام اور بات میں یک رنگی ویکسانیت کو اپنی سیرت کا جوہر کامل بنالے تو اسلام جیسے خالص دین فطرت کی طلب میں ضرور لوگ داعی کے اردگرد اکٹھا ہوں گے اور سچا اسلام پاکر اسے اپنے دل اور اعضاء وجوارح میں جاری وساری کریں گے۔

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

(۲)

تحریر: ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

''الھلال کا اجراء''

خود مولانا کا قول ہے کہ اس پرچے کی اشاعت کا ایک مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا بھی تھا۔ ۲۵/ اگست ۱۹۲۱ء کو آگرے میں مجلس خلافت کا خطبہ پڑھتے ہوئے مولانا نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''الہلال'' کے پہلے نمبر جولائی ۱۹۱۲ء میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا۔ کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمان کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہوسکتا ہے، جو نہ صرف ایشیا کو، مشرق کو بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کو سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے، اس کو مٹا رہا ہے، جس کے برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر، حضور ﷺ کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا۔ وہ نمونہ جو خود جناب سرور کائنات نے دی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں...... ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانانِ ہندوستان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہوسکتی ہے وہ محمد ﷺ کی آواز تھی، اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہ اس کے الفاظ ہیں: "انه أمة واحدة"، ہم ان قبیلوں سے جو مدینے کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں، اور ہم سب مل کر أمة واحدة بننا چاہتے ہیں۔ امۃ کے معنی ہیں قوم اور نیشن، اور واحدۃ کا معنی ہیں ایک''۔ (خطبات آزاد ص ۵۰)

● ایمان ویقین کی قوت اور مقصد سے محبت وشغف کے لئے درج ذیل اقتباس پر غور فرمایئے:

''یہیں یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ ''الہلال'' کاروباری مشغلہ نہیں تھا۔ اس دور میں عام روش یہ تھی کہ اخبارات

رؤسا سے خصوصی چندے اور عطیات لیا کرتے تھے بلکہ بعض تو انہی کے رحم وکرم یا سرکاری نوازشوں پر پلتے تھے اور ان سے سودا کیا کرتے تھے۔"الہلال" کا پہلا پرچہ ہی دیکھ کر ایک مشہور والی ریاست نے ایک معقول رقم کا چک مولانا کے پاس اس وعدے کے ساتھ بھیجا کہ "ہر ماہ اتنی ہی رقم آپ کے پاس پہونچ جایا کرے گی۔" ابوالکلام آزاد نے رقم واپس کرتے ہوئے لکھا کہ "ہم نے جو کام اپنے ذمے لئے ہیں وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤساء کے جود وسخا پر بھروسا کر کےنہیں، بلکہ صرف اس کے فضل وتوفیق پر جواپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک بار سن لیتا ہےتو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔" (شخصیت اور کارنامے،۴۱۱)

مولانا آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو کوشش کی ان پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

"الہلال" نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی، پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پالٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لئے بیروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے، گورنمنٹ کی تفرقہ پرور پالیسی نے انہیں اس فریب میں مبتلا کررکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہوجائے گی، مگر"الہلال" نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہوکر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی، اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریکِ خلافت وسوراج ہے۔" (آثار ابوالکلام،ص۴۲)

ملک کی خدمت

کچھ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اسلام کو مانتے ہوئے ہندوستان کی خدمت ممکن نہیں، مولانا آزاد اسے تسلیم نہیں کرتے، ان کے یہاں مذہب اور سیاست دو چیزیں نہ تھیں،

انہوں نے ۱۹۱۳ء میں الہلال میں لکھا تھا:

"مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں، ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے، انہوں نے جس جوش وایثار سے جنگ طرابلس وبلقان اور مسجد کانپور کے معاملہ میں حصہ لیا تھا اس معاملہ میں بھی اسی طرح حصہ لیں، مسلمانوں کا نصب العین خدمتِ عالم ہے، وہ انسانیت کے خادم ہیں، ان کے لئے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس، اور اسکے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔"

● ہندوستان کی خدمت اور اسلام کے ساتھ وفاداری دونوں کے مابین مولانا کے یہاں کوئی تضاد نہ تھا، ڈاکٹر کامل قریشی لکھتے ہیں:

"انہوں نے "الہلال" کے ذریعے اپنے ان عقائد کی تشریح کرتے ہوئے بار بار لکھا کہ اسلام اور نیشنل ازم ایک

دوسرے کے ضد نہیں، یہ دونوں ایک ہیں، مسلمان کے لیے اپنے وطن کی خدمت اور تعمیر وترقی کی فکر اسلام کے احکامات میں داخل ہے، اسی طرح وطنیت اور اسلامیت کے درمیان بھی کوئی فرق وتضاد نہیں، ایک ہندوستانی مسلمان جس طرح اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرسکتا ہے، اتنا ہی اپنے مسلمان ہونے پر بھی اس کو فخر ہونا چاہئے۔ مولانا کے یہاں مذہب اور سیاست دو چیزیں نہ تھیں، ان کے عقیدے کے مطابق ان کی سیاست بھی مذہب کے راستے ہی سے آئی تھی، وہ ملک کی جدوجہد آزادی میں اسی لیے لگے تھے کہ یہ ان کے نزدیک فریضۂ اسلام سے کم نہ تھا۔

مولانا جب ایک بار پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے اقلیتوں اور خصوصا اسلام کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

''گیارہ صدیاں گزر گئیں، اور ہندوستان کی سرزمین سے بھی اسلام اسی طرح وابستہ ہے جس طرح کہ ہندودھرم، اگر ملک کے باشندوں کا ہندودھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔'' (شخصیت اور کارنامے،۲۰۳،۲۰۴)

● مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شریک کرنے اور وطن کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کے لئے مولانا آزاد نے ''الہلال کے ۱۸؍دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں لکھا تھا:

''جو ہونیوالا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی، یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا سیاسی انقلاب برپا ہوچکا ہوگا، غلامی کی بیڑیاں جو اس نے ازخود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کے ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی، فرض کرو کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو تمہیں معلوم ہے کہ اس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا اور ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں میں چھپ گئے، ملک گیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا، ہندوؤں نے اس کے لئے جدوجہد شروع کی پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہے، بلکہ مجنونانہ طور پر بے چیخ اٹھے کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

.....آنے والا مؤرخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا، لیکن دنیا یاد رکھے گی کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفرازی سے ہوا جو مسلم نہ تھی۔'' (شخصیت اور کارنامے،۲۳۳)

● مولانا آزاد کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد کی قیمت کتنی تھی اس سلسلہ میں ڈاکٹر کامل قریشی لکھتے ہیں:

''ہم وطن ہندوؤں اور دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر آزدی کی لڑائی لڑنے کے لیے مولانا آزاد نے جن باتوں کو ایمان ویقین کی حد تک اپنے پیشِ نظر رکھا ان میں ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کو اولیت

حاصل تھی انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ہندو مسلم اور ملک کے دوسرے طبقوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیا تھا۔ انگریزوں سے نجات حاصل کرنے اور ملک کو آزادی دلانے کے لیے یہ انتہائی ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، ان میں باہمی اتحاد کا جذبہ، مشترکہ تہذیب کا احساس اور متحدہ قومیت کی اہمیت وافادیت کا خیال بیدار کیا جائے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے مولانا آزاد نے 'الہلال'' کے اوراق اور اپنی زندگی کے شب وروز وقف کر دیے جس کے سبب ملک میں جنگ آزادی کے لیے ایک نیا متحدہ میدان تیار ہوا، مولانا آزاد ناپسندیدہ بات گوارا کر سکتے تھے، لیکن ہندو مسلم اتحاد ان کی اتنا عزیز تھا کہ اس پر وہ آزادئ کامل بھی قربان کر سکتے تھے۔ ایسی آزادی جو اتحاد باہمی کے بغیر ملے وہ ان کے نزدیک بربادی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر کئی جگہ اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنے دلی جذبات پر روشنی ڈالی ہے، آگرے کی صوبائی مجلسِ خلافت کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''ہندوستان کے لیے، ہندوستان کی آزادی کے لیے، صداقت وحق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرائض ادا کرنے کے لیے، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی یک جہتی ضروری ہے، اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو انہیں یہ کام بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انجام دینا چاہیے۔''

وہ آگے اپنے اسی عقیدے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک کہ وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے سچائی کے ساتھ اتحاد واتفاق نہ کر لیں...

ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے ۲۲ رکروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔''

وہ اتحاد باہمی کی بات اسی پر ختم نہیں کرتے، اپنے عقیدے کی پختگی کے اظہار کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں:

''اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اس وقت انجام دیں جب ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اس وقت لکھوایا تھا جب ہم سب مل کر قریش کے مقابل ایک نیشن بن جانا چاہتے تھے۔''

ایک بار مولانا نے اپنی گرفتاری سے قبل ایک اور اپیل جاری کرتے ہوئے جن باتوں کا اظہار کیا تھا، اس میں جن پہلوؤں کو پیش نظر رکھا تھا وہ ان کے دلی جذبات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور ان سے ان کے جذبۂ اسلام پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔'' (شخصیت اور کارنامے:ص۲۰۲-۲۰۳)

● عام طور پر وہ شہادت معتبر سمجھی جاتی ہے جو ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے مذہب والے کے لئے دے، مولانا آزاد ایک عظیم الشان تھے، ان کی خدمات کا اعتراف ہر ایک نے کیا، اور اس اعتراف کا مقام زیادہ ہے جو دوسروں کی طرف سے کیا گیا، مولانا آزاد کس طرح مذہبی غیر جانبداری اور قومی اتحاد کے حامی تھے اس کا حال گلزار دہلوی صاحب کی زبان میں سنیے۔

''اللہ تعالی موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، جس نے سیکولرزم، ڈیموکریٹک، سوشلزم، بے تعصب ہم مذہبی عوامی جمہوریت کی بنا اور بقا کے لیے جام فنا پیا۔ایک آزاد، غیور، خوددار، خودمختار، سیکولر ہندوستان کے استحکام وتعمیر اور نا دانستہ غیر جانبداری، پرامن بقائے باہمی اور ترقی یافتہ جدید روشن ہندوستان بنانے کے خطوط میں جواہر لال کے ساتھ ہم آہنگ رنگ آمیزی کی۔مولانا کی وفات کے بعد مجھے معذرت کے ساتھ کہنے کی اجازت دیجئے جواہر لال اس ملک میں اکیلے تھے اور One man Party کے لیڈر تھے۔ہوسکتا میری یہ ذاتی رائے ہونے کی وجہ سے غلط ہو مگر وقت کا مطالعہ اور مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے۔'' (شخصیت اور کارنامے:ص۱۶۸)

ملک کی تقسیم اور ہندوستانی مسلمان

- مولانا آزاد ملک کی تقسیم کے مخالف تھے، اس رجحان کے خطرناک نتائج ان کی نظر میں تھے، لیکن ملک کی تقسیم ہوئی، اب مسلمان کیا کریں، مولانا اس سلسلہ میں بڑی واضح رائے رکھتے تھے۔

انہوں نے برصغیر کی مشترکہ تہذیب میں تقسیم کی گنجائش نہ ہونے کی ایک عمدہ مثال دی تھی:

''پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے، لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے، چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہو جاتی ہے۔''

● مولانا آزاد کا نظریہ اور ان کی سوچ بیحد درست تھی، انہوں نے جو کچھ کہا حالات سے اس کی تصدیق ہوئی، لیکن ہندوستان کے لوگوں نے ان کی بات کو دھیان سے نہیں سنا اور صحیح ڈھنگ سے ان پر عمل نہیں کیا، اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے، ڈاکٹر قریشی مولانا آزاد کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد زندگی میں اپنوں کے مطعون رہے، موت کے بعد اپنوں اور بیگانوں دونوں کے معتوب ہو کر فراموش کر دیئے گئے، ان کے نہ جانے کیا کیا سنہری خواب تھے، وہ آزادی کے متوالے تھے جو ملک کی تقسیم کے ساتھ ملی، وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، انہیں ہندو مسلم فرقہ پرستی سے دوچار ہونا پڑا، وہ ملک میں متحدہ قومیت، سیکولرازم اور جمہوریت کو سرسبز

دیکھنا چاہتے تھے، لیکن انہیں خزاں ہاتھ آئی، وہ صوبہ پرستی، علاقائیت اور محدود فکر ونظر کے مخالف تھے، ملک میں یہ زہر کس قدر سرایت کر گیا ہے اسے کون جھٹلا سکتا ہے، وہ ہندوستان کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں خوش حال دیکھنے کے آرزومند تھے، مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ منطقی، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی طور پر مسلم معاشرہ جس طرح انحطاط پذیر ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں، اردو زبان، کلچر اور دوسرے مسائل کا کیا حال ہے، یہ سب باتیں کسی سے چھپی ہوئی نہیں، یہ سب خواب ابھی تک ادھورے ہیں، مولانا زندگی بھر ان خوابوں کی حسین تعبیر کے لیے ملک وقوم کی خدمت میں لگے رہے اور جاتے وقت جو کچھ کہہ گئے وہ پتھر کی لکیر ہے، جو کچھ کر گئے وہ زندہ جاوید ہے، او جو کچھ چھوڑ گئے، اس کی حقیقت آج بھی اتنی ہی مسلم ہے جتنی ان کے زمانے میں تھی۔'' (شخصیت اور کارنامے، ۲۱۴)

● ملک کی تقسیم سے پیدا ہونے والے خطرناک نتائج سے مولانا آزاد اچھی طرح واقف تھے، اس طرح ان کی نظر میں وہ خطرات بھی تھے جو علاقائی ولسانی عصبیتوں سے پیدا ہوتے ہیں، ڈاکٹر کامل قریشی کہتے ہیں: ن

''مولانا آزاد دل کی گہرائیوں سے قومیت اور وطن پرستی کے جذبات سے سرشار تھے، لیکن وہ اپنی مستقبل شناس آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لوگ خود کو ہندوستانی کہنے کے بجائے اگر بنگالی، پنجابی، گجراتی اور مہاراشٹری کہتے رہے، اور صوبہ پرستی، علاقہ پرستی اور زبان پرستی کرتے رہے تو ملک کے نیشنل ازم کا کیا ہوگا، آج کے حالات سے کیا اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا کتنی دور تک دیکھ رہے تھے۔

مولانا کو اس پر تو افسوس تھا کہ ملک تقسیم ہوا اور ہندو مسلم اس تقسیم کو نہ روک سکے اس لیے سیاسی طور پر ناکام رہے، لیکن اس سب کے باجود وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو اپنی معاشرت وتہذیب کو تقسیم نہیں کرنا چاہئے، ان کی حفاظت سب کا مقدس فریضہ ہے۔ (ایضا: ص ۲۱۱)

● ملک کی تقسیم کے بعد یہاں مسلمان کس طرح رہ سکتے ہیں اور ان کی وفاداری کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے، یہ مسئلہ آج بھی اٹھایا جاتا ہے، مولانا آزاد کا ذہن اس سلسلہ میں بالکل صاف تھا اور وہ مسلمانوں کو آزاد ہندوستان کا سب سے بہتر شہری دیکھنے کے لئے ان کے سامنے تجویز پیش کرتے تھے:

''اس لیے ایک نباض وقت اور طبیب قوم کی طرح انہوں نے منتشر اور بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک بار پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں اس لیے جمع کیا کہ بدلی ہوئی فضا میں یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے، ملک میں کن خطوط پر تنظیم نو قائم کی جائے اور کس طرح آزاد ہندوستان میں مسلمان اپنے قومی فرائض سے عہدہ برآ ہوں۔

اس موقع پر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے طویل اور تاریخی خطبے میں مولانا نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ ہر طرح اہمیت کا حامل ہے، مولانا نے فرمایا کہ تقسیم ملک کے بعد آزاد ہندوستان میں جو مسلمان ہیں یہ ان کا وطن ہے، انہیں

یہاں عزت وآبرو سے رہنے، اپنے سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی امور آزادی سے انجام دینے کا حق ہے، ماضی کی جس غلط سیاست نے نقصان عظیم پہنچایا ہے، مسلمان اس سے بچیں، ہندوستان کی مشترکہ اور جمہوری شہریت میں اپنا مقام پیدا کریں قوم وملک سے فرقہ پرستی کے زہر کوختم کرنے میں اپنا رول ادا کریں، ہم وطنوں کے دوش بدوش چل کر ملک کے سچے شہریوں کی طرح تعمیر وترقی کے منصوبوں میں لگ جائیں، اپنا پورا زور باہمی اتحاد، سیکولرازم، اور جمہوریت کی جڑوں کومضبوط کرنے میں لگادیں۔اس خطبے کے آخری الفاظ مولانا کی زبان میں ملاحظہ ہوں:

''جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف دوٹوک فیصلہ کرلیں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام، سیاسی میدان میں فرقہ واری بنیاد پر قائم نہ کریں گے کسی مجلس کے مقصد پر فقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہئے۔''

مولانا نے اس موقعہ پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہوکر ملک کی تعمیر وترقی میں لگ جانے کا مشورہ دیا تھا، کافی غور وخوض کے بعد ایک تجویز کی۔

روشنی میں ایک کمیٹی کی تشکیل ''اتحاد وترقی'' کے نام عمل میں لائی گئی تھی جس کی شاخیں یوپی میں کچھ جگہ قائم کی گئیں لیکن بعض نامعلوم حالات کی بناپر یہ کمیٹی کچھ عرصہ کام کر کے ختم ہوگئی۔(شخصیت اور کارنامے: ۲۰۸، ۲۰۹)

● مذہبی غیر جانبداری قائم کرنے اوراسے برقرار رکھنے کے لئے حق اور انصاف کی پابندی ضروری ہے، اگر ہم نے خاندانی، ملی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے حق وانصاف کا دامن چھوڑ دیا تو پھر مذکورہ غیر جانبداری قائم نہیں رہ سکتی۔مولانا آزاد اس باریکی کو سمجھتے تھے، حق کی حمایت اور انصاف کے تحفظ کے لئے انہوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ حقدار کا مذہب کیا ہے، دہلی کے ایک مشہور لکھنے والے ''گلزار زُتشی دہلوی خود اپنا واقعہ لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ روزانہ ''ملاپ'' میں ایک سب ایڈیٹر نے میرے خلاف ایک شذرہ سپرد قلم کیا۔جس میں ہندو ہوکر آستانۂ محبوب الٰہی سے وابستگی اور وہاں ادارۂ نظامیہ کی نظامت واعتماد کے پس منظر میں کچھ طنز اور نکتہ چینی کی گئی تھی۔کروڑوں انسانوں، لاکھوں دانشوروں، ہزاروں رہنماؤں اور سینکڑوں وزیروں اور امیروں کی دلی میں ایک ادنی اردو کے نوجوان خادم اور عام انسان کے بارے میں امام الہند اتنی خبر سے بھی متاثر ہوسکتے ہیں، اس کا علم مجھے جب ہوا جب ''ملاپ'' اخبار کے مالک شری رنبیر جی نے ایک طرف اور مولانا اجمل خاں نے دوسری طرف مجھے مطلع کیا کہ مولانا نے اس کی انکوائری کی اور ایسی خبر چھاپنے والے کو سخت ہدایت احتیاط دی گئیں، گرچہ وہی ہندو ادیب وشاعر آخر میں اردو اور فارسی کلچر کا رسیا ہوا۔''(شخصیت اور کارنامے: ۱۶۴)، مذہب کے نام پر ہمارے سامنے انسانیت کو پامال کیا جارہا ہے، لیکن مولانا آزاد مذہب کو کیا سمجھتے ہیں، اس کا تذکرہ ڈاکٹر کامل قریشی کے الفاظ میں سنیئے:

''مولانا کے نزدیک مذہب ملانے والی چیز تھی، لڑانے والی نہیں، جوڑنے والی شی تھی، توڑنے والی نہیں، مذہب انسانوں کو

انسانیت سے بہرہ ور کرنے اور بندوں کو خدا سے ملانے کا نام ہے، یہ گمراہوں کو راہِ راست پر لاتا ہے اور راہِ راست پر چلنے والوں کو منزل مقصود تک پہنچا تا ہے۔ مولانا کے مذہبی خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''انہوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے، مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔'' (شخصیت اور کارنامے:۱۹۹)

● مولانا آزاد کے مشن کو دوسرے لیڈروں نے کامیاب بنایا:

''موالانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے جو ذاتی کوششیں کیں ان میں ان کے ہم نواؤں کے طور پر بہت سے اور ہندو مسلم اکابرین قوم بھی شریک تھے جن میں خاص طور پر گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سر فہرست تھے، جن کی نظر میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خیر و برکت مولانا کے مشن کی کامیابی میں پوشیدہ تھی، یہ رہنمایانِ قوم زندگی بھر مولانا کے اس مشن کے داعی بن کر کام کرتے رہے، گاندھی جی اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں اس کا پرچار کرتے رہے، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد اپنی شخصیتوں کے اعتبار سے متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی یادگار بن چکے تھے۔'' خواجہ غلام السیدین کا یہ قول اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے، وہ کہتے ہیں:

''قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں ہیونارڈ دونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے۔''

ہندوستان کے سیاسی سین پر جلوہ گر ہونے کے بعد مولانا آزاد اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ ایک خوشگوار اور متحد ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ تحریکِ خلافت اور تحریک ترک موالات کے دوران جس تاریخی قومی اتحاد کا مظاہر یہاں کے ہندو مسلمانوں نے مل کر کیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر گاندھی جی، علی برادران، مولانا آزاد اور دوسرے بہت سے نامور رہبرانِ قوم جمع ہو گئے تھے جس سے انگریزی طاقت لرز گئی تھی لیکن پھر اس نے اپنی حکمت عملی سے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے سازشیں شروع کر دیں اور کچھ ہی زمانے کے بعد وہ اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ گیا، جیسے جیسے آزادی کی جدو جہد تیز ہوئی انگریزوں نے ہندوستان کے باہمی اتفاق کو ختم کرنے کی کوششوں میں بھی تیزی کر دی اور وہ ہندو مسلمان جو ابھی تک مشتبہ کے جدو جہد سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انگریزی طاقت کے سامنے صف آرا تھے، طبقوں میں بٹ گئے، متحدہ ہندوستان کے بجائے ملک تقسیم کا نعرہ لگنا شروع ہو گیا اور اس طرح دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔'' (شخصیت اور کارنامے:۲۰۵،۲۰۶)

☆☆☆

عہدے اور منصب کا اسلامی تصور

مولانا اسعد اعظمی/ استاذ جامعہ سلفیہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين،ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وبعد:

عہدہ ومنصب ایک ایسی انسانی ضرورت ہے جس سے کوئی بھی طبقہ یا کوئی بھی قوم استغناء کا دعوی نہیں کرسکتی، انسانی ضرورت ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ زمان ومکان، رنگ وجنس اور کسی بھی طرح کی حدود وقیود سے بالا یہ ضرورت ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو بعض حیوانوں میں بھی قیادت وسیادت کی کچھ شکلیں ملتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، یعنی فطرتا وہ دوسرے انسانوں کی طرف مائل، ان کا محتاج اور ان کے تعاون اور تعامل کا خواستگار ہوتا ہے، کوئی انسان اس دنیا میں تنہا زندگی نہ بسر کرتا ہے نہ کرسکتا ہے، اسے قدم قدم پر دوسرے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اس طرح بنی نوع انسان کے تمام افراد ایک دوسرے کے محتاج بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لئے کارآمد بھی۔ یہی چیز ان کے اندر اجتماعیت کا موجب بنتی ہے، پھر اس اجتماعی زندگی کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے اور اسے منظّم کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو ذمہ دار مانا جانا بھی ضروری ہے:

لا يصلح الناس فوضى لا سراة لهم

اگر سب لوگ برابر ہوں اور کوئی ان کا بڑا یا رئیس نہ ہو تو ان کا معاملہ درست ہی نہیں ہوسکتا۔

یہی چیز عہدہ اور منصب کی متقاضی ہوئی اور یہیں سے ارباب اقتدار اور اہل منصب کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب ظاہر بات ہے کہ اسلام جو ایک مکمل دین اور کامل نظام زندگی ہے اس نے اس اہم انسانی ضرورت کو ضرور اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہوگا اور اس سے متعلق اصول وضوابط اور ارشادات وہدایات پیش کیا ہوگا، اس غرض سے جب اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں گے تو اندازہ ہوگا کہ واقعی اسلام نے اس موضوع کو اس کے تمام متعلقہ گوشوں کے ساتھ بالتفصیل بیان کیا ہے، اور اس تعلق سے اس کی ہدایتیں- دیگر تعلیمات وہدایات کی طرح - بڑی واضح اور دوٹوک ہیں۔

اس موضوع پر کتاب وسنت میں جو تعلیمات وہدایات وارد ہوئی ہیں ان کے ایک معتد بہ حصہ کو جمع کرنے کے بعد اگر اس کو فنی اور موضوعی اعتبار سے ترتیب دیا جائے تو درج ذیل نقاط کے تحت اسے مندرج کیا جاسکتا ہے۔

☆ منصب کی ضرورت اور اہمیت -قرآن سے

منصب کی ضرورت واہمیت- احادیث نبویہ سے

☆ اہل منصب کا انتخاب اور اس سے متعلقہ مسائل

☆ مناصب کے اہل لوگوں کی قلت

☆ منصب طلب کرنے کی ممانعت

☆ منصب سے دور رہنے کی تلقین

☆ منصب قضا سے اجتناب کی خصوصی تلقین

منصب قضاء سے اجتناب کے چند واقعات

☆ ایک ''اشکال'' اور اس کا ''جواب''

☆ انصاف ور اہل منصب کے فضائل

☆ نیک اہل منصب کے اثرات

☆ اہل منصب کے لئے کچھ ہدایتیں، دعائیں، وعدے اور وعیدیں



سطور ذیل میں مذکورہ بالا جزئیات پر بالاختصار روشنی ڈالی جارہی ہے۔

منصب کی ضرورت واہمیت قرآن کی روشنی میں:

قرآن کریم کی جن نصوص میں منصب کی ضرورت واہمیت کا تذکرہ یا اس کی طرف اشارہ ملتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

☆ آیت کریمہ: ﴿إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها، وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل، إن الله نعما يعظكم به، إن الله كان سميعا بصيرا، يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم، فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر، ذلك خير وأحسن تأويلا﴾ (سورہ نساء:۵۸-۵۹)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ، اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً وہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالیٰ کر رہا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سنتا ہے دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول (ﷺ) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی،

پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ اللہ تعالی کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالی پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔

پہلی آیت کا نزول اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت عثمان بن طلحہ کو خانہ کعبہ کی کنجیاں سونپنے کے لئے ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۸۵-۶۸۷ و تفسیر احسن البیان ص: ۲۴۴) لیکن اس میں منصب اور اہل منصب کی ذمہ داریوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت عثمان بن طلحہ والا واقعہ بالتفصیل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بات بہت مشہور ہے کہ یہ آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی، لیکن چاہے اسی سلسلے میں نازل ہوئی ہو یا نہ نازل ہوئی اس کا حکم عام ہے، اس لئے ابن عباس اور محمد بن الحنفیہ کہتے ہیں کہ یہ نیک وبد سب کے لئے ہے یعنی یہ حکم سب کے لئے ہے، اور ﴿وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل﴾ میں اللہ نے لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے، اسی لئے محمد بن کعب، زید بن اسلم اور شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ یہ آیت امراء- یعنی حکام بین الناس- کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(۱)

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''علماء کا کہنا ہے کہ پہلی آیت (آیت نمبر ۵۸) حکام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان کے اوپر واجب ہے کہ امانتیں امانت والوں کے حوالے کر دیا کریں اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت انصاف سے فیصلہ کریں، اور دوسری آیت فوج اور دیگر رعایا وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اس کام کو کرنے والے حکام کی اطاعت کریں......''۔(۲)

صاحب احسن البیان آیت کی تفسیر میں حضرت عثمان بن طلحہ والا واقعہ بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

''آیت کا یہ سبب نزول اگرچہ خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اس کے مخاطب عوام اور حکام دونوں ہیں، دونوں کو تاکید ہے کہ امانتیں انہیں پہنچاؤ جو امانتوں کے اہل ہیں، اس میں ایک تو وہ امانتیں شامل ہیں جو کسی نہ کسی کے پاس رکھوائی ہوں، ان میں خیانت نہ کی جائے بلکہ یہ بحفاظت عند الطلب لوٹا دی جائیں، دوسرے عہدے اور مناصب اہل لوگوں کو دیئے جائیں، محض سیاسی بنیاد یا نسلی ووطنی یا قرابت وخاندان کی بنیاد یا کوٹہ سسٹم کی بنیاد پر عہدہ ومنصب دینا اس آیت کے خلاف ہے''۔(۳)

☆ آیت کریمہ: ﴿لقد أرسلنا بالبينات وأنزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۸۷۔ (۲) السیاسۃ الشرعیۃ ص: ۴۔
(۳) تفسیر احسن البیان ص: ۲۴۴-۲۴۵۔

بالقسط، وأنزلنا الحديد فيه بأس شديد ومنافع للناس وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب ان الله قوي عزيز﴾ (سورہ حدید:۲۵)

ترجمہ: یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت وقوت ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی (بہت سے) فائدے ہیں، اور اس لئے بھی کہ اللہ جان لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد بے دیکھے کون کرتا ہے، بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے کہ اس نے کتاب اور لوہا اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور اسی لئے نبی ﷺ نے اپنی امت کو امراء و حکام کو نصب کرنے کا حکم دیا اور حکام کو حکم دیا کہ لوگوں کو ان کی امانتیں لوٹائیں اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں تو انصاف سے فیصلہ کریں، اور لوگوں کو حکم دیا کہ اللہ کی اطاعت کے کاموں میں حکام کی اطاعت کریں''۔(۱)

☆ موسی علیہ السلام کا اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے یہ کہنا: ﴿اخلفني في قومي وأصلح ولا تتبع سبيل المفسدين﴾ (سورہ اعراف:۱۴۲)

ترجمہ: میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا۔

اس سے عزالدین بن عبدالسلام نے نصب امیر پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ رعایا کی مصلحتوں کے تحقق اور ان سے مفاسد کے دفعیہ کے لئے امراء کا تعین ہوتا ہے، جیسا کہ آیت دلالت کرتی ہے۔(۲)

مزید فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ سرپرستی وامارت افضل طاعات میں سے ہے، اور عادل امراء کا اجر وثواب ومقام ومرتبہ دوسروں سے بڑا ہے، کیونکہ ان کے ذریعہ کثرت سے حدود کی تنفیذ اور باطل کا ازالہ ہوتا ہے۔(۳)

☆ امام بدرالدین ابن جماعہ نے اللہ تعالی کے قول ﴿ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض﴾ (سورہ بقرہ:۲۵۱) (ترجمہ) اگر اللہ تعالی بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا، سے امامت عظمی کے وجوب پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اللہ رب العزت نے زمین میں سلطان کو متعین کیا جو طاقتور کو کمزور سے ہٹاتا ہے اور مظلوم کو ظالم سے انصاف دلاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے، پھر اللہ تعالی

(۱) الحسبۃ فی الاسلام، ص:۷۔ (۲) قواعد الاحکام فی مصالح الأنام:۱/۶۳-۶۴۔
(۳) ایضا:۱/۱۲۰۔

نے اپنے بندوں پر اس بات کا احسان جتایا کہ اس نے ان کے واسطے حاکم متعین کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ولکن الله ذو فضل علی العالمین﴾ (سورہ بقرہ:۲۵۱)۔(۱)

منصب کی ضرورت واہمیت احادیث نبویہ کی روشنی میں:

جن احادیث سے قائدین اور اہل منصب کو مقرر کرنے کی مشروعیت اور ضرورت کا ثبوت ملتا ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ عن أبی سعید وأبی هريرة رضی الله عنهما قالا: قال رسول الله ﷺ: "اذا خرج ثلاثة فی سفر فليؤمروا أحدهم"۔ (۲)

جب تین آدمی بھی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک شخص کو امیر بنالیں۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''سفر کے عارضی اور تھوڑے اجتماع کے لئے ایک آدمی کو امیر بنانے کا آپ ﷺ نے حکم دے کر گویا یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ تمام اجتماعی کاموں میں ایسا کیا جائے''۔(۳)

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے "اذا خرج ثلاثة ......" والی حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

وسنده حسن، وله شواهد، انظرها إن شئت فی "المجمع" (۵/ ۲۵۵)۔ (۴)

مجمع الزوائد کی کتاب الجہاد، باب الامیر فی السفر میں چار روایتیں مذکور ہیں جن میں سے دو مرفوع اور دو موقوف ہیں، مرفوع میں پہلی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اذا سافرتم فليؤمكم أقرؤكم وإن كان أصغركم، فإذا أمكم فهو أميركم" (۵)

جب تم سفر کرو تو تم میں کا جو سب سے زیادہ قرآن کا قاری ہو وہ تمہاری امامت کرے اگر چہ تم میں وہ سب سے چھوٹا ہو، اور جب وہ تمہاری امامت کرے تو وہی تمہارا امیر ہوگا۔

دوسری مرفوع روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ان الفاظ سے ہے:

"اذا كانوا ثلاثة فلا يتناج اثنان دون الثالث، وإذا كانوا فی سفر فليؤمروا أحدهم"۔ (۶)

(۱) تحریر الاحکام فی تدبیر أهل الاسلام، ص:۴۹۔
(۲) رواہ ابوداود، وصححہ الالبانی، صحیح الجامع الصغیر، برقم ۵۰۰۔
(۳) السیاسۃ الشرعیۃ، ص:۱۳۹۔
(۴) السلسلۃ الضعیفۃ: ۵۸۹۔
(۵) مجمع الزوائد: ۵/۴۶۵، حدیث نمبر: ۹۳۰۶۔
(۶) مجمع الزوائد: ۵/۴۶۵، حدیث نمبر: ۹۳۰۷۔

اگر تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک آدمی کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں چپکے چپکے بات چیت نہ کریں اور اگر سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

اور پہلی موقوف روایت حضرت عمر بن خطاب کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

" اذا كنتم ثلاثة فى سفر فأمروا عليكم أحدكم، ذاك أمير أمّره رسول الله ﷺ". (۱)

جب تم لوگ تین آدمی بھی سفر میں رہو تو ایک کو اپنا امیر بنالو، وہ نبی اکرم ﷺ کا متعین کردہ امیر ہوگا۔

دوسری موقوف روایت عبداللہ بن مسعود کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

" اذا كنتم (ثلاثة) فى سفر، فأمروا عليكم أحدكم [ولا يتناج اثنان دون صاحبهما". (۲)

جب تم لوگ (تین آدمی بھی) سفر میں رہو تو ایک کو اپنا امیر بنالو (اور ایک کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں چپکے چپکے بات نہ کریں)۔

واضح رہے کہ یہ تمام روایتیں پہلی حدیث کے شواہد کے طور پر ہیں جیسا کہ علامہ البانی کا قول اوپر مذکور ہوا ہے۔

اسی طرح وہ تمام حدیثیں جن میں امراء وحکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے خلاف بغاوت اور شورش سے منع کیا گیا ہے، اور ایسا کرنے یا امام وقت سے بیعت نہ کرنے پر سوء خاتمہ کی وعید بیان کی گئی ہے، یہ حدیثیں بھی نصب امیر کے وجوب ہی پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ وعید ترک واجب ہی پر ہوتی ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ "ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب " یعنی جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو وہ بھی واجب ہے۔

واضح رہے کہ احادیث میں والی اور امیر وغیرہ کا جو لفظ آیا ہے وہ صرف امام اعظم یا خلیفہ اکبر ہی کے لئے مختص نہیں، بلکہ چھوٹے بڑے ہر منصب کو شامل ہے، چنانچہ شیخ محمد المبارک "ولاية" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"الولاية هي الكلمة الجامعة التي أطلقها المسلمون على سلطة الحكم، ويندرج فيها كافة السلطات من الخلافة إلى أصغر الوظائف" (۳)

یعنی ''ولایت'' ایسا لفظ ہے جسے مسلمانوں نے حکومت اور سلطنت کے معنی میں استعمال کیا ہے، اس میں خلافت سے

(۱) مجمع الزوائد: ۵/۲۶۴، حدیث نمبر: ۹۳۰۵۔ (۲) مجمع الزوائد: ۵/۲۶۵، حدیث نمبر: ۹۳۰۸۔

(۳) بحوالہ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ والولایۃ السیاسیۃ الکبری ص: ۹۷۔

لے کر چھوٹے سے چھوٹا منصب بھی شامل ہے۔

اور علامہ ابن تیمیہ ''اولوالامر'' کے لفظ کی جامعیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وكل من كان متبوعا فانه من أولى الأمر" ہر متبوع (جس کے ماتحت کچھ لوگ ہوں) اولوالامر کے مفہوم میں داخل ہے۔(۱)

علامہ ابن حجر حدیث: "سبعة يظلهم الله ...... امام عادل ...... " میں امام عادل کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" والمراد به صاحب الولاية العظمى، ويلتحق به كل من ولي شيئامن أمور المسلمين فعدل فيه"۔ (۲)

امام سے مراد وہ شخص ہے جسے اقتدار اعلی حاصل ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنا اور اس نے انصاف سے کام کیا۔

شیخ محمد عبدہ اولوالامر کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "هم جماعة أهل الحل والعقد من المسلمين، وهم الأمراء والحكام، والعلماء ورؤساء الجند، وسائر الرؤساء، والزعماء الذين يرجع اليهم الناس فى الحاجات والمصالح العامة ......"۔ (۳)

یعنی اولوالامر سے مراد مسلمانوں میں سے اہل حل وعقد کی جماعت ہے، جس میں امراء، حکام، علماء، رؤسائے لشکر اور وہ تمام سرداران اور قائدین داخل ہیں جن کی طرف لوگ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے لئے رجوع کرتے ہیں۔

(جاری)



(۱) الحسبۃ فی الاسلام ص:۱۰۴۔ (۲) فتح الباری:۱۸۸/۲۔
(۳) تفسیر المنار:۱۸۱/۵۔

کتاب ''ہدایۃ النحو'' میں غلطیوں کا تنقیدی جائزہ

ابوارشد اعظمی

''محدث'' بنارس اپریل ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر محمد لیث محمد لال محمد مکی، زادہ اللہ علما وفضلا، کا تنقیدی مضمون میری حقیر تحریر شائع شدہ ''محدث'' فروری ۲۰۰۸ء پر ردعمل کے طور پر شائع ہوا ہے، مجھے افسوس ہے کہ میری اس تحریر سے ڈاکٹر صاحب کو سخت تکلیف پہنچی ہے، اللہ تعالی شاہد ہے کہ میرا مقصود ان کی دل آزاری ہرگز نہیں تھا، میں بصدق دل معذرت خواہ ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے جس جارحانہ اسلوب کا ذکر کیا ہے، اسے ایک مسلم بھائی کی لغزش سمجھ کر درگزر فرمائیں۔

ساتھ ہی یہ خوشی بھی ہوئی کہ انہوں نے میری چوحدی کی پیمائش کرتے ہوئے جس طنز وتعریض سے نوازا ہے، وہ انتقام کا خوبصورت طریقہ ہے، میری تحریر کی اشاعت کے فورا بعد معلوم ہوا کہ میرا جغرافیائی رقبہ معلوم کرنے کے لئے وہ پریشان ہیں، اور متعدد لوگوں سے بذریعہ فون بھی دریافت کر رہے ہیں کہ یہ لکھنے والا کون ہے؟

اس کے خلاف اپنا حال یہ رہا کہ گزشتہ تحریر کے وقت پوری توجہ صرف ان کے مقالے پر مرکوز تھی، یہاں تک کہ جائزہ نگار کے نام والقاب اور علمی وعملی بلندوں وسرگرمیوں کے بارے میں جستجو کا کوئی خیال بھی نہیں گذرا، ہمارے پیش نظر جائزے کے صرف مندرجات رہے، یہ ہماری کمزوری ہے کہ کسی کے علمی وفکری نقوش کے دائرے سے باہر اس کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے، شاید یہی چیز ڈاکٹر صاحب کی دل آزاری کا باعث ہوگئی۔

دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے ''ہدایۃ النحو'' پر جو مؤاخذات سپرد قلم کئے ہیں، ان کے اکثر حصے میں ایجاز وابہام یا اجمال کی جو کیفیت ہے، اس کا تقاضا تھا کہ ہم پہلے ان کی توضیح وتشریح کے لئے ڈاکٹر صاحب کی طرف مراجعہ کرتے، کیونکہ أهل البيت أدرى بما فيه لیکن ایسا نہ کرکے بعض مقامی ازہری علماء کی خدمت میں ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ جائزہ پیش کیا، تو انہوں نے مطالعہ کے بعد اس مشکل کو حل کرنے سے معذرت کردی، اب ہدایۃ النحو پر ڈاکٹر صاحب کے مؤاخذات کے فہم وادراک اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہم اپنے ہی عقلی واجتہادی گھوڑے دوڑانے پر مجبور ہوئے، المجتهد قد يخطىء ويصيب، محدث اپریل میں ڈاکٹر صاحب نے ''جائزہ'' کے عنوان سے ہمارا جو رد کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے

کہ ہم ان کے عظیم مبلغ علم سے بہت نیچے اور پیچھے ہیں، اوران کے معانی مقصودہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔

فی الوقت قارئین کی خدمت میں اپنے تاثرات کو پیش کرنے کی جرأت کی جارہی ہے، ان میں حسب سابق اصل مسئلہ کے متعلق گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنے یا ان کی شخصیت کے کسی پہلو سے تعرض کرنے سے امکانی حد تک پرہیز کیا جائے گا، البتہ احقاق حق کے تعلق سے ع: بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر - کا معاملہ پیش آجائے تو مجبوری ہے۔

پہلا مسئلہ- ہدایۃ النحو میں ''اعراب'' کی تعریف:

"الإعراب ما به يختلف آخر المعرب، كالضمة والفتحة والكسرة والواو والألف والياء".

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تعریف غلط ہے، اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ "به" میں "ب" اگر تعلیل کے لئے مانا جائے تو تعریف کا پہلا جزء تو صحیح ہوگا، لیکن تمثیل کا جزء غلط ہوگا، اس لئے کہ فتحہ، ضمہ، کسرہ وغیرہ علامت اعراب ہیں نہ کہ اعراب، اور اگر اسے استعانت کے لئے مانا جائے تو تعریف علامت اعراب کی ہوجائے گی، نہ کہ اعراب کی۔

اس پر ہم نے سرسری نظر کے تحت ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ دعوی اور دلیل پر تین ملاحظات لکھ کر اعراب کی مذکورہ تعریف کو صحیح قرار دیا تھا، اس کے رد میں ڈاکٹر صاحب کی جانب سے جو ''جائزہ'' محدث اپریل میں شائع ہوا ہے، قبل اس کے کہ اس پر کچھ عرض کیا جائے، اہل علم اور محترم قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بتائیں یا فیصلہ کریں کہ کیا دلیل کی مذکورہ دونوں شقیں فہم مطلب کے لئے کافی ہیں، یا تشنۂ توضیح وتشریح ہیں؟ ہم جیسے ناقص العلم والفہم کے لئے یہ دونوں شقیں ایسی لگتی ہیں کہ شرح جامی کے رنگ میں اردو عبارت ہیں، یہاں پر ہمیں استاذ محترم مولانا مجاز اعظمی حفظہ اللہ کا قول یاد آرہا ہے کہ بعض لوگ جب کوئی بات سمجھنے یا سمجھانے سے قاصر ہوتے ہیں تو کوئی مشکل جملہ کہہ دیتے ہیں۔ دلیل مذکور کے ابہام واغلاق کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحب نے بھی فرمایا ہے، انہی کے الفاظ میں سنیں:

''میں اہل علم کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مولانا نے تمثیل کا کیا مفہوم لیا ہے؟.......................تمثیل سے میری مراد کسی چیز کی تعریف کرتے ہوئے اس کی مثال ذکر کرنا ہے، تو اس مفہوم میں تمثیل میری رائے میں تعریف کا جزء ہوتی ہے''۔

یہ اعتراف صرف ایک آسان ومعمولی لفظ ''تمثیل'' کے معنوی ابہام کے بارے میں ہے، لیکن ''ب'' تعلیلیہ اور استعانۃ کے حوالے سے جو ابہام دبیز پردوں میں چھپا ہوا ہے، اس کی نقاب کشائی کب ہوگی؟ اسی ابہام نے ہمیں ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں تضاد بیانی کی راہ دکھائی ہے، ڈاکٹر صاحب نے ہماری اور اپنی باتوں کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ اہل علم کے حوالے کیا ہے، اس کا استقبال ہم بھی کرتے ہیں، فی الحال لفظ ''تمثیل'' کے معنوی ابہام کو رفع کرتے ہوئے ڈاکٹر

صاحب نے اپنی رائے کو اپنے دعوی پر دلیل بنانے کی جو کوشش کی ہے، ہم اس پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کا پورا قول ملاحظہ ہو:

''تمثیل سے میری مراد کسی چیز کی تعریف کرتے ہوئے اس کی مثال بیان کرنا ہے، تو اس مفہوم میں تمثیل میری رائے میں تعریف کا جزء ہوتی ہے، اور دونوں کے مابین من کل الوجوہ مطابقت ضروری ہوتی ہے، اہل علم غالبا اس رائے سے اتفاق کریں گے''۔

قارئین کی سہولت کے لئے یہ بتانا مفید ہوگا کہ منقولہ عبارت کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہدایۃ النحو میں اعراب کی مذکورہ تعریف ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس لئے غلط ہے کہ ''ب'' تعلیلیہ ماننے کی صورت میں تعریف کا پہلا جزء صحیح ہوگا، لیکن تمثیل کا جزء غلط ہوگا، اس لئے کہ فتحہ، ضمہ، کسرہ وغیرہ علامات اعراب ہیں، نہ کہ اعراب، یعنی اعراب کی مثال ضمہ، فتحہ وکسرہ وغیرہ سے ذکر کرنا غلط ہے، اس لئے اعراب کی تعریف صحیح ہوتے ہوئے بھی غلط ہوگئی۔

نظر وفکر- محترم قارئین کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ''ہدایۃ النحو'' میں اعراب کی تعریف کو غلط ثابت کرنے کی ساری عمارت ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے پر کھڑی ہوئی ہے، جو یہ ہے کہ کسی چیز کی صحیح تعریف کے لئے دو جزء کا ہونا ضروری ہے، ایک نفس تعریف، دوسرے مثال، ان دونوں میں سے صرف ایک کے صحیح ہونے اور دوسرے تمثیلی جزء کے غلط ہونے سے تعریف کی ساری عمارت زمین بوس ہوجائے گی، اب اہل علم ہی بتائیں گے کہ اس استدلال میں علم وفہم کی کتنی پونجی ہے، اور احقاق حق کا کونسا منہج ہے؟ اور کسی چیز کی صحت وخطا کے لئے ایک شخص کی ذاتی رائے کو کب پیمانہ بنایا گیا ہے؟ پھر یہ رائے بھی ایسی کہ اپنی بے حقیقتی کا صاف وشفاف بولتا آئینہ ہے۔

ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ اگر تعریف کی صحت کے لئے دو جزء (تعریف ومثال) ضروری ہیں تو سیکڑوں، ہزاروں تعریفات کا خون ہوجائے گا جن کی مثالیں ندارد ہیں، اسی علم نحو کی کتابوں میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یہ کتابیں عام طور پر ''کلمہ'' کی تعریف سے شروع ہوتی ہیں، لیکن اس کی مثال کے ذکر سے خالی ہوتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری تردید کے جوش میں اپنی رائے مذکور جو ان کی اپنی مزعومہ دلیل ہے، کی تغلیط خود ہی کر بیٹھے، اور یہ ثابت کردیا کہ جزء ثانی (مثال) کے بغیر تعریف صحیح ہوتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''ورنہ مولانا موصوف کی رائے کے مطابق اگر انسان کی تعریف "هو جسم نامی حساس متحرك بالإرادة ناطق" (الکلیات لابی البقاء الکفوی ص۳۹۲) سے ذکر کرکے اس کی مثال میں "كالحمار" کہا جائے تو انسان کی تعریف میں کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔

یہ کلام ہماری اور بالواسطہ مؤلف کی تحمیق کے لئے لکھا گیا ہے، لیکن معاملہ الٹ گیا، کیونکہ انسان کی تعریف بغیر مثال

مذکور ہے، جو یقینی طور پر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صحیح ہے، اور کفوی کے حوالے سے مستند ہے۔

ثابت ہوا کہ تمثیل، تعریف کا جزء نہیں ہوتی ہے، اس لئے اس کا عدم ذکر یا غلط ہونا تعریف کی صحت وخطا کے لئے کچھ بھی مؤثر نہیں ہے، البتہ جب تعریف کے ساتھ مثال بھی مذکور ہوتو دونوں کے درمیان مطابقت ہونی چاہئے، رہا یہ مسئلہ کہ ضمہ، فتحہ، کسرہ وغیرہ اعراب ہیں یا علامت اعراب، اس پر آگے گفتگو ہوگی۔

ہمارا موقف- ہم نے اپنی پہلی تحریر میں ڈاکٹر صاحب کے استدلال میں تضاد کا ذکر کیا تھا، اس کے جواب میں ہم کو بھی اسی کا ملزم بنایا ہے، اور تقریبا ایک صفحہ اس کی نذر کر دیا ہے، اور اس کا اختتام ہم پر اپنے تعریضی عمل سے فرمایا ہے، واقعی ان کی تعریض کا فن قابل داد ہے۔

زیر بحث مسئلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ہدایۃ النحو میں اعراب کی مذکورہ تعریف مکمل اور صحیح ہے، تمثیل کا جزء چاہے صحیح ہو یا نہ ہو، تعریف میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ ابھی اس کو ثابت کیا جا چکا ہے، مزید دلیل آگے آرہی ہے، دوسرے یہ کہ ضمہ، فتحہ، کسرہ وغیرہ اعراب کی مثالیں ہیں، اور اس کی تعریف کے مطابق ہیں، ان دونوں باتوں پر دلیلیں حسب ذیل ہیں:

فن نحو کی جو کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں، ان میں اعراب کی جو تعریف ذکر کی گئی ہے وہ بعینہ نقل کی جاتی ہے:

(۱) "الإعراب ما اختلف آخره به، ليدل على المعانى المعتورة عليه" (كافيه)

(۲) "الإعراب هو أثر ظاهر أو مقدر، بجلبه العامل في آخر الكلمة" (مذكرة النحو، ص ۷۳)

(۳) "الإعراب هو: تغيير أواخر الكلم لاختلاف العوامل الداخلة عليها لفظا أو تقديرا" (التحفة السنية ص ۱۵)

(٤) "الإعراب أثر ظاهر، أو مقدر يجلبه العامل فى آخر الاسم المتمكن والفعل المضارع" (شرح شذور الذهب ص ۳۳)

اعراب کی تعریف کے یہ چند نمونے ہیں، جن کو قدیم وجدید علماء نحو نے اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے، ان میں سے کسی نے مثال نہیں ذکر کی ہے، البتہ ابن ہشام نے اعراب کے دو معنی لغوی اور اصطلاحی بیان کرنے کے بعد مثال ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مثال الآثار الظاهرة: الضمة والفتحة والكسرة ــــــــــــ ومثال الآثار المقدرة وما تعتقده منويا فى آخر نحو " الفتى" من قولك "جاء الفتى " و "رأيت الفتى " و "مررت بالفتى " فإنك تقدر فى آخره فى المثال الأول ضمة، وفى الثانى فتحة، وفى الثالث كسرة، وتلك الحركات

المقدرة إعراب، كما أن الحركات الظاهرة فی آخر "زيد" إعراب". (أيضا)

علماءِ نحو کی مذکورہ بالا تصریحات دو باتوں پر بیّن دلیل ہیں، ایک یہ کہ تمثیل کسی تعریف کا جزء نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کے بغیر تعریف مکمل اور صحیح ہوتی ہے، اور اس کی صحت متنازع بھی نہیں ہے، پس تمثیل کو تعریف کا جزء کہنا ایسی بدیہی غلطی ہے کہ "لم يسبق إليه أحد قبل"، دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ ضمہ، فتحہ، کسرہ وغیرہ اعراب کی مثال ہیں، نہ کہ علامت اعراب کی، جیسا کہ شرح شذور الذھب کی مذکورہ عبارت اس پر ناطق ہے، اس لئے ہدایۃ النحو میں اعراب کی مثال اور تمثیل دونوں صحیح ہیں۔

ملحوظہ - یہاں پر ایک بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ افہام وتفہیم کے لئے ضمہ، فتحہ، کسرہ کو کبھی اعراب اور کبھی علامت اعراب یا علامت رفع، نصب اور جر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس سے اصل مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اور نہ صحت وغلط کا سوال پیدا ہوتا ہے، عباراتنا شتی وحسنك واحد۔ ملاحظہ ہو مذکرۃ النحو، شرح شذور الذھب وغیرہ۔ ہدایۃ النحو اس اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ مبتدیوں کو مسائل نحو سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہو، اگر اس طرح کی لفظی بحثوں میں ان کو الجھایا جائے تو تسہیل وتیسیر کی افادیت باقی نہیں رہے گی، اور تعسیر کا پہلو غالب آ جائے گا، مثلاً ڈاکٹر صاحب کی تیسیر النحو کی طرح ہدایۃ النحو میں بھی اعراب کی مثال رفع، نصب اور جر سے بیان کی جاتی، تو اعراب کی یہ مثال تشنۂ توضیح وتفہیم رہتی، ان تینوں کو محسوس طور پر ضمہ، فتحہ وغیرہ ہی کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا ہے، اس لئے مؤلف ہدایۃ النحو نے اعراب کی مثال میں رفع، نصب اور جر کے بجائے سیدھے سیدھے ضمہ وغیرہ کو ذکر کیا ہے۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری ایک غلطی یہ ذکر کی ہے کہ ان کی کتاب ''تیسیر النحو'' جامعہ عالیہ عربیہ اور مئو کے بعض مکتبات میں پہنچ چکی ہے، اگر آپ (یہ راقم الحروف) اعراب کی تعریف اس میں دیکھ لیتے تو شاید آپ ایسا نہیں لکھتے، سبحان اللہ، شہسواری میدان میں اور گھوڑا امکان میں، ہمیں ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسی سطحی باتیں محدث کے صفحات پر لکھی جا رہی ہیں، کاش یہ سلسلہ شروع ہی نہ ہوا ہوتا۔

خبر کی تعریف - ڈاکٹر صاحب نے اپنے پہلے جائزے میں لکھا تھا کہ ''ہدایۃ النحو میں خبر کی تعریف اسم سے کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ خبر صرف اسم مفرد نہیں ہوتی ہے، بلکہ جملہ اسمیہ وجملہ فعلیہ بھی ہوتی ہے''۔

اس پر ہم نے ''سرسری نظر'' میں لکھا تھا کہ ہدایۃ النحو میں مذکورہ تعریف کو غیر صحیح کہنا صحیح نہیں ہے، اس کے ثبوت میں اور تعریف مذکور کی صحت کے بارے میں جو باتیں لکھی تھیں ان کو یکسر قلم انداز کر کے صرف وہ ٹکڑا نقل کیا ہے، جسے کھینچ تان کر تعریف کو لنگڑی لولی دکھایا جا سکے، اسی طرز عمل سے لگتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک اپنی بات اونچی رکھنے کے لئے دیانت کا خون مباح ہے، اور وہ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں، بہتر ہوگا کہ حقیقت جاننے کے لئے ساقط القلم حصہ جو اصل ہے، یہاں

نقل کر دیا جائے۔ لگتا ہے کہ تعریف مذکور کے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر لکھ دیا گیا ہے کہ ''خبر صرف اسم مفرد نہیں ہوتی'' کیونکہ مؤلف نے خبر کی تعریف اگر چہ اسم سے کی ہے، لیکن حصر کے ساتھ اور مفرد کی قید کے ساتھ اس کو ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے ''صرف'' اور ''مفرد'' کے الفاظ کا اضافہ کر کے مؤلف کی بیان کردہ تعریف کو غیر صحیح کہنا صحیح نہیں ہے الخ۔ اب اس میں اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ مؤلف نے مبتدا اور خبر کی تعریف بیک لفظ یوں کی ہے: "هما اسمان مجردان عن العوامل اللفظية" مبتدا اور خبر پر ''اسمان'' کا اطلاق ایسا ہی ہے جیسا "أبوين وقمرين"۔ حق و دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ جائزے میں ہمارے قول مذکور کا جائزہ لیا گیا ہوتا، اور اس کے صحیح و غلط ہونے پر گفتگو کی گئی ہوتی، لیکن ایسا کچھ نہ کر کے بلا ضرورت ایسی بات کا ذکر طولانی فرمایا گیا ہے، جو بلا دلیل سب کے نزدیک مسلّم ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''بلا شبہ میں نے مولانا جیسے اساتذہ کرام سے پڑھا ہے کہ تعریف جامع و مانع ہونا چاہئے الخ''۔

کیا ان اساتذہ کرام سے یہ بھی پڑھا ہے کہ ہدایۃ النحو میں اعراب اور خبر وغیرہ کی تعریفات جامع و مانع نہ ہونے سے غلط ہیں؟

رہا یہ سوال کہ ہدایۃ النحو میں خبر کی مذکور تعریف جامع و مانع نہیں ہے؟ اور تقریباً ڈیڑھ صفحہ کے بعد مؤلف کے قول "وقد يكون الخبر جملة اسمية ...... أو فعلية" کو تعریف کا جزء مانا جائے گا؟

سرسری نظر میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے، جسے گول کر دیا گیا، اور ابھی سطور بالا میں بھی مزید توضیح کر دی گئی ہے، اگر بالفرض ہدایۃ النحو میں خبر کی تعریف جامع و مانع نہیں ہے، تو اس غلطی میں دوسرے مؤلفین نحو بھی شریک ہیں، چاہے خبر کی تعریف اسم سے کی ہو یا عام لفظ سے، دیکھئے "التحفة السنية" میں خبر کی تعریف "هو الاسم المرفوع الذى يسند إلى المبتدأ ويحمل عليه"۔ (ص ۸۸)، "شذور الذهب" میں یوں ہے: "الرابع خبره، وهو: ما تحصل به الفائدة مع مبتدإ غير الوصف المذكور" (ص ۱۸۳)، "كافية" میں ہے: "الخبر، هو المجرد المسند المغاير للصفة المذكورة"، "شرح ابن عقيل" میں تعریف کے الفاظ یہ ہیں: "الخبر: الجزء المكمل للفائدة" (۱/۲۰۱)

بتایا جائے کہ یہ تعریفات جامع و مانع ہیں تو ہدایۃ النحو والی تعریف کیوں نہیں ہے؟ اور اگر نہیں ہیں تو ان کی تغلیط کیوں نہیں کی جارہی ہے؟ صرف ہدایۃ النحو کو تنقید و تغلیط کا نشانہ کیوں بنایا جارہا ہے؟ کیا اس لئے کہ اس کی جگہ ''تیسیر النحو'' کو رواج دیا جائے؟ یہ بھی بتایا جائے کہ کس کتاب میں جملہ اسمیہ و فعلیہ کو بھی تعریف کا جزء بنا کر جامع و مانع ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے؟ جب کہ ہدایۃ النحو کی طرح دوسری کتب نحو میں جملہ اسمیہ و فعلیہ کو اقسام خبر سے ذکر کیا گیا ہے، جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ جملہ اسمیہ و فعلیہ ہونا خبر کی تعریف کا جزء نہیں ہے، ملاحظہ ہو ''مذکرۃ النحو'' ص ۹۹ تا ۱۰۱، ''التحفۃ السنیۃ''

ص۸۹، شرح ابن عقیل ۱/۲۰۲۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''ابن عقیل وغیرہ کے یہاں خبر کی جامع مانع تعریف موجود ہے، انہیں لوگوں سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ''تیسیر النحو'' میں اور مزید آسان تعریف کرنے کی کوشش کی ہے''۔

ابن عقیل نے دو تعریف نقل کی ہے، الفیہ کی تعریف پر نقد کیا ہے کہ وہ مانع نہیں ہے، رہی جامع ہونے کی بات تو دونوں تعریفوں میں خبر کے جملہ اسمیہ وفعلیہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر بھی ابن عقیل نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، اس حوالے سے خبر کی جامع ومانع آسان تعریف کیسے ہوگئی؟ کیا یہ صورت حال کہ جس مصدر سے استدلال کیا جارہا ہے وہی ان کے خلاف حجت نہیں ہے؟ دیکھئے خود ابن عقیل تقریباً ایک صفحہ کے بعد فصل قائم کر کے کہتے ہیں: "ينقسم الخبر الى مفرد وجملة"۔

تعبیر کی غلطی-ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''میں نے لکھا تھا: (والضمة إعراب) میں تعبیر کی غلطی ہے، اس لئے کہ ضمہ اعراب نہیں ہے''۔

اس پر شروع میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، اس کو پھر پڑھ لیا جائے۔

آگے فرماتے ہیں:

''میں نے لکھا تھا ''فاعل جب ضمیر ہو تو فعل کیسا ہوگا؟ اس کو (صاحب ہدایۃ النحو'' بیان کرتے ہوئے صفحہ ۱۹ پر فرماتے ہیں (وإن كان مضمرا وحد للواحد نحو زيد ضرب، وثنى للمثنى نحو الزيدان ضربا، وجمع للجمع نحو الزيدون ضربوا) میں تعبیر کی غلطی ہے، اس لئے کہ فعل واحد، تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا الخ''۔

اس سے متعلق مولانا فرماتے ہیں'' جائزے میں اس پر جو طویل گفتگو کی گئی ہے، وہ کئی لغزشوں پر مشتمل ہے'' اہل علم حضرات ذرا لفظ'' کئی'' پر غور کریں اور بتائیں کہ مولانا نے کتنی لغزشوں کو ذکر کیا ہے، میری سمجھ کے مطابق صرف تین لغزشوں کا ذکر کیا ہے، اور ان کی بھی حقیقت ابھی سامنے آجائے گی۔

لگتا ہے کہ ہماری مذکورہ بات کا جواب بڑے اشتعال وجلال کے عالم میں لکھا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ پہلے یہ بتائیں کہ لفظ'' کئی'' کتنے عدد پر بولا جاتا ہے؟ ہم نے لغزشوں کی نمبرنگ کر کے نہیں لکھا ہے، آپ نے تین لغزشوں کی تعیین خود ہی فرمائی ہے، تو کیا تین پر'' کئی'' کا اطلاق غلط ہے؟ پھر اسی عالم جلال میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ ''ان کی بھی حقیقت ابھی سامنے آجائے گی''۔

ہم نے سرسری نظر میں فعل کے تثنیہ وجمع کے تعلق سے تعبیر کی غلطی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اس کے سر اور پیر کو بریدہ کر کے اور اس کے درمیان کا صرف ایک ٹکڑا نقل کر کے اس کا مثلہ کر دیا گیا ہے، ایسا کون لوگ کرتے ہیں اور کیوں کرتے

ہیں، یہ محتاج بیان نہیں ہے۔

ہماری عبارت کے منقولہ ٹکڑے کی حقیقت سامنے لاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اہل نظر قارئین کرام ذرا غور فرمائیں اگر عبارت کے الفاظ جس صریح معنی پر دلالت کرتے ہیں، وہی معنی میں سمجھوں تو میں عبارت کے فہم میں کوتاہی کا مجرم ٹھہروں، اور مولانا اگر وہ معنی مراد لیں جس پر عبارت بدون تاویل دلالت نہیں کرتی تو وہی عین صواف ٹھہرے، تعبیر کی اس غلطی کو تو میں نے بیان کرنے کی کوشش کی تھی''۔

ہم اس بارے میں معافی چاہتے ہوئے پھر یہ گستاخی کریں گے کہ عبارت کا جو صریحی مدلول سمجھا گیا ہے، وہ یقیناً فہم کی کوتاہی کی دلیل ہے، اور ہمارے بیان کردہ معنی کو تاویلی کہنا بھی ایسا ہے، اس کی مثال یہ ہے: (واسئل القرية)، اہل نظر کیا کوئی عربی سے واقفیت رکھنے والا یہی کہے گا کہ اس کا معنی "واسئل أهل القرية" ہے، اگر یہ تعبیر غلط ہے تو کلام اللہ بھی اس سے پاک نہیں ہے، العياذ بالله۔ اسی طرح "موت العالم موت العالم" تو زبان زد عام وخاص ہے، اس قسم کی مثالیں بکثرت ہیں، اور ہر زبان ومکان میں شائع وذائع ہیں، ان سب کو بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

اہل علم کا شیوہ ہوتا ہے کہ بزرگوں کے تسامح وخطا کی بھی توجیہ کرکے صحیح محمل پر محمول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہاں پر معاملہ ہی الٹا ہے، ان کی صحیح بات کو بھی غلط ثابت کرنے کی زبردستی کوشش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب آگے فرماتے ہیں:

''دوسری لغزش کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''رہی یہ بات کہ فعل واحد، مثنی اور جمع نہیں ہوتا ہے (اس لئے کہ فعل جنس ہوتا ہے) نافہمی پر مبنی ہے، پہلے فعل کے جنس ہونے کا مفہوم سمجھنا چاہئے''۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے تین جواب دیئے ہیں، ہم بالترتیب ہر ایک پر گفتگو کریں گے، فرماتے ہیں:

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ نافہمی ہے تو اس کا مرتکب میں نہیں ہوں، ڈاکٹر غریب عبدالمعید نافع ہیں''۔

نافہمی کے مرتکب ڈاکٹر غریب نہیں ہیں، بلکہ ان کی بات کو نہ سمجھنے والے اس کے مرتکب ہیں۔

''دوسری بات یہ کہ فعل کے جنس پر دلالت کرنے کا جو واضح اور سادہ سا مفہوم ڈاکٹر غریب نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تم "ضرب زيد عمروا" کہتے ہو تو اس کے مفہوم میں یہ تینوں چیزیں شامل ہوتی ہیں کہ ایک بار مارا، یا دو یا کئی بار، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ فعل واحد، تثنیہ اور جمع پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ جنس پر دلالت کرتا ہے، جس کا اطلاق قلیل اور کثیر دونوں پر ہوتا ہے''۔

ڈاکٹر مکی صاحب سے سوال ہے کہ ڈاکٹر غریب کے کس قول کا یہ مفہوم ہے کہ فعل واحد، تثنیہ اور جمع پر دلالت نہیں کرتا، جب کہ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ''اس کے مفہوم میں یہ تینوں چیزیں شامل ہیں کہ ایک بار مارا، یا دو، یا کئی بار مارا،

کیا ایک بار یا دو یا کئی بار مارا، واحد، تثنیہ اور جمع یا قلیل و کثیر نہیں ہیں؟

دوسرے یہ کہ فعل کے جنس ہونے کا جو مفہوم ہم نے سمجھا ہے، وہ لکھ دیا ہے، اگر چہ ڈاکٹر مکی صاحب کی سمجھ سے بالاتر ہے، اس لئے ان سے دوسرا سوال یہ ہے کہ فعل کے جنس ہونے سے کیا مراد ہے؟ فعل ماضی، فعل مضارع، امر یا اور کچھ؟ اس کو مثال سے تنصیص کے ساتھ سمجھائیں، مثلا "یفعلان" اور "یفعلون" میں کون سی چیز فعل ہے جو تثنیہ اور جمع نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب آگے فرماتے ہیں:

''تیسری بات یہ کہ فعل کے جنس ہونے کا جو مفہوم و مدلول مولانا نے سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ کسی نتیجہ پر پہنچتی نہیں دکھائی دے رہی ہے، میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں کہ مولانا نے فعل کے جنس ہونے کا مفہوم مصدر کو قرار دیا ہے، اور مصدر جنس ہوتا ہے، جس کا اطلاق قلیل و کثیر دونوں پر ہوتا ہے، لیکن مصدر سے مشتق فعل ماضی وغیرہ جنس نہیں ہو سکتے، اس تفریق کی اساس اور بنیاد کیا ہے؟ اور مولانا اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے''۔

ہم نے کوئی منطقی استدلال نہیں کیا ہے کہ سمجھنے میں دشواری پیش آئے، مزید یہ کہ ہماری تحریر نقل کر کے جو سوال کیا گیا ہے، اس کے آخری جملے میں جواب موجود ہے، لیکن اس کو حذف کر کے ہماری بات کو نافہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال سوال کا جواب کہ مصدر ایک حالت پر رہتا ہے، اس کے تثنیہ اور جمع کے صیغے نہیں بنائے جاتے، اور نہ اس میں کوئی زمانہ ہوتا ہے، (المصدر حدث بغیر زمن)، اس کے برخلاف فعل مشتق کے صیغے تثنیہ اور جمع کی صورت میں بنائے جاتے ہیں، اور اس میں کوئی زمانہ شامل ہوتا ہے، جو کسی چیز کے جنس ہونے کے منافی ہے، یہ ہے تفریق کی اساس، ایسی بدیہی بات بتاتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔

دوسرا سوال انتہائی حیرت انگیز ہے، یہ سوال ڈاکٹر صاحب کو خود سے کرنا چاہئے؟ اس سے تو لگتا ہے کہ انہوں نے جو لکھا ہے اسے خود بھی نہیں سمجھا ہے، بات خود ہی چھیڑی کہ "وحد للواحد" میں تعبیر کی غلطی ہے، کیونکہ فعل جنس ہے جو تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا ہے، ہم اس پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے عرض کر چکے ہیں کہ افہام و تفہیم کے لئے یہ تعبیر کس طرح صحیح ہے، اور فعل کے جنس ہونے کی حقیقت کیا ہے، پھر اس بنیاد پر تعبیر کی غلطی پر استدلال کن غلط فہمیوں پر مشتمل ہے؟ آپ نے یہ بحث چھیڑ کر جو کچھ ثابت کرنا چاہا ہے، ہم نے اسی کی ناقدانہ تحقیق کر کے ہدایۃ النحو میں تعبیر کی تصویب کرنی چاہی ہے۔

سرسری نظر میں ہم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول کہ ''فعل واحد نہیں ہوتا'' آفتاب نصف النہار کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ مصدر، مشتق اور ہر اسم جنس (لفظا) مفرد ہوتا ہے، اہل فن میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا ہے، اور نہ یہ کہا ہے کہ (لا یوحد)۔

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب بابصیرت قارئین کرام سے فیصلہ کرا رہے ہیں کہ مصدر، فعل مشتق اور اسم جنس کا مفرد

ہونا آفتاب نصف النہار ہے، یا وہ ٹمٹماتا چراغ بھی نہیں ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں پر غلط فہمی یا غلط بیانی ہوئی ہے تو غالباً ڈاکٹر صاحب کا جلال سوا ہو جائے گا، جیسا کہ انہوں نے ہم کو ابھی بجھا ہوا چراغ کہا ہے، ہم نے مصدر وغیرہ کے لفظاً مفرد ہونے پر تین دلیلیں دی ہیں، ایک یہ کہ اہل فن میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا ہے، دوسری یہ کہ کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ "لا یوحد" پہلی دلیل کے جواب میں محمد طنطاوی کے قول کے دو اقتباسات نقل کر کے فرماتے ہیں'' یہ دونوں اقتباسات بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ اسم جنس مفرد نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر وہ مفرد ہوتا تو محمد طنطاوی کے اس قول کا کیا مفہوم ہوگا ؟ (ویفرق بینه وبین مفرده عند قصد التنصیص علی الوحدة بالیاء قلیلا ...... وبالتاء ...... "۔

کوئی بابصیرت یا بے بصیرت قاری بتائے کہ طنطاوی سے منقول ۷سطری اقتباس میں کون لفظ بانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ اسم جنس لفظاً مفرد و واحد نہیں ہوتا، جس جملے (یفرق بینه وبین مفرده الخ) سے استدلال کیا گیا ہے، اس کا مفہوم خود ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں ہے، کیونکہ وہ خود ہی سوال کر رہے ہیں کہ اس قول کا کیا مفہوم ہوگا؟ اگر واقعی مفہوم معلوم ہوتا، تو مابہ الاستدلال منقولہ جملے کا مفہوم یہ نہیں بیان کرتے کہ ''یعنی وحش اسم جنس ہے، نہ کہ واحد و مفرد، اس کا مفرد وحشی ہے الخ'' یہ ہے اسم جنس کے مفرد نہ ہونے پر استدلال کی حقیقت، یہ بات نحو میر ہی میں پڑھی پڑھائی ہے کہ وحدۃ و مرۃ کے لئے مصدر کو تاء کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، جیسے ضربة ، جلسة ، یہاں پر زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ مصدر اسم جنس ہے، اور لفظاً مفرد ہوتا ہے، مثنی اور جمع نہیں ہوتا، یا بنایا نہیں جاتا، بہر حال محمد طنطاوی کے قول سے ہماری بات کہ'' اہل فن میں سے کسی نے اسم جنس کے مفرد ہونے کا انکار نہیں کیا ہے'' پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے، کیونکہ خود طنطاوی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے، اسی طرح ہماری دوسری دلیل کہ کسی نے یہ نہیں کیا ہے کہ "لا یوحد" اپنی جگہ پر روشن حقیقت کے روپ میں باقی ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ اس کے مفرد ہونے کا انکار آفتاب نصف النہار کے انکار کے مترادف ہے، یہ بات اس بنیاد پر کہا تھا کہ مصدر و اسم جنس کے لئے جب ضمیر لائی جاتی ہے تو وہ واحد ہی ہوتی ہے، جیسے (هل عندکم من علم فتخرجوه لنا) (الانعام:۱۴۸) اور (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون) (الحجر:۹)

ہماری تیسری دلیل یہ تھی کہ ڈاکٹر غریب کے قول میں صراحت ہے کہ فعل (مصدر) کو مثنی اور جمع نہیں بنایا جاتا، اس میں واحد و مفرد ہونے یا بنانے کی نفی نہیں کی گئی ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ'' اس کے جواب میں گذشتہ باتیں کافی ہیں'' گذشتہ باتوں کا حال ابھی بیان ہو چکا ہے، رہا ڈاکٹر غریب کے قول'' جب کوئی چیز مفرد ہوتی ہے الخ'' کو غور سے پڑھنے کا مشورہ، تو شکریہ، ہم تو یہی نہیں سمجھ پائے کہ اس کا تعلق اس جنس سے کیسے ہے؟

تحدید اور بغیر تحدید- ہماری پہلی تحریر (سرسری نظر) میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں، لفظ'' بغیر تحدید'' ڈاکٹر غریب

کے قول میں مذکور ہے، اسی کے حوالے سے گفتگو کی گئی تھی، ڈاکٹر مکی صاحب کا اعتراض ہم پر یہ ہے کہ ان دونوں لفظوں کا مفہوم ہم نے کیا سمجھا ہے؟ محترم! جب بغیر تحدید کا مفہوم آپ نے سمجھ لیا ہے، تو اس سے تحدید کا مفہوم خود ہی واضح ہو جاتا ہے، وبضدها تتبين الأشياء۔

اصول عدد- ڈاکٹر صاحب نے ہدایۃ النحو پر پہلے جائزے میں لکھا تھا:

''عشرون اور اس کے اخوات کو مصنف نے جمع مانا ہے، اس لئے کہ اصول عدد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (وأصول العدد اثنتا عشرة كلمة، واحدة إلى عشرة، ومائة وألف) ان کا یہ قول اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب دہائیوں کے الفاظ کو جمع مانا جائے''۔

ہم نے سرسری نظر میں لکھا تھا کہ یہ تنقیدی کلام انتہائی مبہم ہے، پھر ہم نے اپنی فہم کے مطابق اس کا ایک مفہوم ذکر کر کے لکھا تھا کہ اگر یہی مفہوم مقصود ہے تو مبہم تنقیدی کلام تعبیری غلطی کا شاہکار ہے، اب قارئین کرام سے بھی سوال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قول منقول کا کوئی مفہوم بتا سکتے ہیں؟ بہرحال ہم نے اپنے ذکر کردہ مفہوم کی روشنی میں جو جواب دیا تھا، اب اس میں کتر بیونت کر کے ہمارے اس جواب کو بھی مبہم بنا دیا، اور آخری ٹکڑا نقل کر کے فرما رہے ہیں کہ:

''پتہ نہیں مولانا نے تولد وتفرع سے کیا مراد لیا ہے؟''

اس کو پڑھ کر ہم سر پیٹنے پر مجبور ہو گئے، یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی سوال کرے کہ ماں سے بچوں کے تولد اور تفرع کا کیا مطلب ہے؟ شاید ع کچھ تو خاطر احباب چاہئے ، کا حق ادا کرنے کی سعی مشکور کی گئی ہے۔

اصطلاحی لفظ- ڈاکٹر صاحب نے پہلے جائزے میں لکھا تھا کہ ہدایۃ النحو میں بعض مقامات پر تعریف کی یہ غلطی نظر آئی کہ وہ ایک اصطلاحی لفظ کو پہلے لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور چند ہی سطروں کے بعد اصطلاحی معنی میں استعمال کرتے ہیں، چنانچہ مضاف الیہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

" وهو كل اسم نسب إليه شيء بواسطة حرف الجر لفظا نحو: مررت بزيد، ويعبر عن هذا التركيب فى الاصطلاح بأنه جار ومجرور، أو تقديرا نحو غلام زيد، ويعبر عنه فى الاصطلاح بأنه مضاف ومضاف اليه"۔

غلطی یہاں پر یہ ہے کہ اصطلاحی لفظ ''المضاف الیہ'' کو پہلے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے، جب کہ متبادر الی الذہن اصطلاحی معنی ہوتا ہے، پھر آخر میں اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے''۔(جائزہ)

ہم نے سرسری نظر میں لکھا تھا کہ ''یہ ناقدانہ کلام انتہائی نافہمی کی کہانی سنا رہا ہے، کیا کوئی ادنی طالب علم بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مؤلف نے مضاف الیہ کی جو تعریف بیان کی ہے وہ مضاف الیہ کا لغوی معنی ہے؟''۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ بات کس قدر ناگوارگذری ہے،اس کوانہی کی زبان سے سنئے:

''مولانا اس سے بھی زیادہ سخت بات مجھے کہتے تو بھی مجھے گوارا تھی ،اس لئے کہ آپ استاذ الاساتذہ ہیں،لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا نے اپنے مقام ومرتبہ کا لحاظ نہیں کیا کہ کہیں میری بات غلط ٹھہری تو یہی وصف میری جانب لوٹ جائے گا''۔

شروع شروع میں ہم عفو ودرگذر کی درخواست کر چکے ہیں، یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے تنبیہ فرمائی ہے کہ مجھے اپنی طالب علمی کی سطح سے اوپر اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے مرتبۂ علمی کی بلندی کو پہچاننا چاہئے، مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ میں علمی دنیا کا ایک ذرۂ خاک ہوں، میرے پاس نہ تو کوئی ڈگری ہے،اور نہ ہی مکی، مدنی کا اعزاز حاصل ہے، مجھ جیسے نااہل کو کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی عظیم علمی شخصیت کو جو پی، ایچ، ڈی، کی ڈگری سے سرفراز ہو اس کی تحریر پر گفتگو کرنے کی گستاخی کرے، دراصل اَن جانے میں یہ حرکت ہوئی ہے،اس لئے کہ میرے سامنے شخصیت اوراس کی ڈگری نہیں تھی ،صرف تحریر تھی، مجھے پہلے ہی سوچنا چاہئے تھا کہ جو سلطان القلم مؤلف ہدایۃ النحو کی غلطیوں کا انبار پیش کر سکتا ہے، وہ کوئی غیر معمولی ہستی نہیں ہوگی، بہرحال اب تو غلطی ہوگئی ہے،معذرت،معذرت،معذرت۔اب اصل مسئلہ کی طرف چلتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب معاف فرمائیں گے، ان کا کلام اکثر مبہم اور شرح کا محتاج ہوتا ہے، اسی وجہ سے قاری غلط فہمی کا شکار ہوجاتا ہے، ہدایۃ النحو سے مضاف الیہ کی منقولہ تعریف میں جو غلطی دکھائی گئی ہے،اوراس پر ہم نے جو کلام کیا ہے، اس کا تعلق صرف نفس عبارت کے ظاہری مفہوم سے ہے، یہ عبارت جس کے سامنے ہوگی اس کا وہی مفہوم بیان کرے گا جو ہم نے ذکر کیا ہے،اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

مذکورہ عبارت کے شروع میں مضاف الیہ کی تعریف بیان کی گئی ہے، پھراس کی مثالوں کی نحوی ترکیب بتائی گئی ہے، تعریف اور ترکیب دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور دونوں کا مدلول بھی جداگانہ ہے، اس میں لغوی اور اصطلاحی تعریف کا کوئی ذکر نہیں ہے''۔

اپریل والے جائزے میں ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ ہدایۃ النحو میں مضاف الیہ کی تعریف میں مؤلف کی جو غلطی بتائی گئی ہے، اس پر استدلال کی بنیاد ان کے پاس ہدایۃ النحو کے موجود نسخے کا حاشیہ نمبر ۸ ہے، لیجئے قصہ ہی ختم ہوگیا، البتہ اتنا عرض کریں گے کہ حاشیہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہدایۃ النحو میں مضاف الیہ کی تعریف (کل اسم) سے (لفظا) تک لغوی معنی میں ہے، اور (تقدیرا) اصطلاحی معنی میں ہے، ڈاکٹر صاحب سے التماس ہے کہ یہ وضاحت کریں کہ مذکورہ لغوی معنی کا لغوی مصدر کیا ہے؟ مجھ جیسے ادنی طالب علم کی فہم یہ کہتی ہے کہ (کل اسم نسب اليه شيء) لغوی معنی ہے، اور (بواسطة حرف الجر) تک مضاف الیہ کی اصطلاحی تعریف ہے، پھر (لفظا وتقديرا) سے اس کی دو

قسموں کا بیان ہے، جیسا کہ نحویوں نے اس کو اقسام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اگر بالفرض تسلیم کرلیا جائے کہ مؤلف نے مضاف الیہ کے پہلے لغوی معنی، پھر اصطلاحی معنی بیان کئے ہیں، تو اس کو غلطی سے تعبیر کرنا کھلی غلطی ہے، کیونکہ اہل علم کے نزدیک کسی لفظ کے لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کرنے سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

" للكلمة معنيان، أحدهما اصطلاحی ...... والمعنى الثانی لغوی ...... للإعراب معنيان: لغوي، وصناعي، فمعناه اللغوي ...... ومعناه الاصطلاحي ...... وغير ذلك" (شذرات الذھب ۱۱-۳۳)، ابن عقیل وغیرہ میں بھی اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ہم کو مضاف الیہ لغوی اور اصطلاحی کے مسئلے میں حاشیہ نمبر ۸ کے حوالے کرکے اور ادنی طالب علم کی صف سے نیچے شمار کرکے اخیر میں ایک اور نیا شگوفہ چھوڑ گئے، فرماتے ہیں:

''اگر مولانا کی بات مان لی جائے تو لازم آئے گا کہ "مررت بزيد" میں زید کو مضاف الیہ اصطلاحی اور "مررت" کو مضاف اصطلاحی مانا جائے، جیسا کہ اصطلاحی مضاف ہونا تمام نحویوں کے نزدیک اسم کی علامت اور خاصیت ہے''۔

مذکورہ کلام مجھ جیسے ادنی طالب علم سے فروتر شخص کی فہم سے بالاتر ہے، اور مضاف الیہ اصطلاحی سے مضاف اصطلاحی تک کا سفر میرے لئے ناقابل عبور جنگل ہے، اگر کچھ کہنے کی جرأت کی جائے تو پتہ نہیں کس حاشیہ کے حوالے سے ہماری ناواقفیت وجہالت کی نقاب کشائی کی جائے گی۔

طباعت کی غلطی- ڈاکٹر صاحب نے ہدایۃ النحو پر حرف گیری کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ہدایۃ النحو میں طباعت کی بہت ساری غلطیاں ہیں'' اس پر ہم نے لکھا تھا کہ ان غلطیوں سے نفس کتاب اور مؤلف کا کیا تعلق ہے؟ ان کے مرتب طابع، ناشر، خریدار اور پڑھنے پڑھانے والے ہیں۔

اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ''مطبوع کتاب میں اگر ایسی غلطیاں ہیں تو وہ ایسی غلطیوں سے متصف مانی جائے گی'' اگر ہم ثبوت کے ساتھ کہیں کہ ایسی غلطیاں نہیں تو کیا جواب ہوگا؟ جیسا کہ ہم سرسری نظر میں ایک ثبوت پیش کر چکے ہیں، لیکن اس کو حسب عادت نظر انداز کردیا گیا ہے، کیا اہل علم کی تحقیق کا یہی منہج ہے، دوسری بات یہ کہ یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دلچسپ سوال داغا ہے۔

''طابع وناشر کے ساتھ خریدنے والے اور پڑھنے پڑھانے والوں کو کھینچ دیا، ایسا کیوں کیا ہے سمجھ میں نہیں آیا''۔

اگر ہم کہیں کہ کسی ڈاکٹر (پی، ایچ، ڈی) کی جانب سے اس قسم کا سوال علم کی اہانت ہے، تو معلوم نہیں ہم کس عتاب میں آجائیں، اگر کسی کتاب میں بہت ساری غلطیاں ہیں پھر بھی اس کو خریدا اور پڑھا پڑھایا جائے تو کس کی غلطی ہے، مصنف

کی؟ اس طرف دھیان نہ دینے سے غلطیوں کی اصلاح ہوگی، یا غلط مطبوع کتابوں کو فروغ حاصل ہوگا؟

یاء مخاطبہ- ہدایۃ النحو کی غلطیوں میں ایک آخری غلطی جسے ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''میں (ڈاکٹر) نے لکھا تھا کہ ''مؤلف نے ضمیر مرفوع متصل کے ضمن میں صرف انہیں ضمیروں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جو فعل ماضی سے متصل ہوتی ہیں، یاء مخاطبہ کی جانب ادنی اشارہ بھی نہیں کیا ہے، جب کہ وہ بھی ضمیر مرفوع متصل ہے، اور فعل مضارع و فعل امر میں استعمال ہوئی ہے، جیسے تفعلین وافعلی، اس پر مولانا کہتے ہیں:

''یہ کوئی نقص اور خامی نہیں ہے، کیونکہ مؤلف نے ماضی سے متصل ضمیروں کو صرف مثالا ذکر کیا ہے، اور مثال میں ان تمام چیزوں کا حصر و احاطہ نہیں کیا جاتا''۔

ہمارے اس قول کے جواب میں طنز کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا میری تغلیط اور صاحب ہدایۃ النحو کے دفاع میں اس طرح کھو گئے کہ ان کا دفاع ایسی دلیل سے کر رہے ہیں، جس کے خلاف خود ان کا قول چند سطروں کے بعد موجود ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں: "فذلك ستون ضميرا" یعنی ضمیر مرفوع متصل بارہ، منفصل بارہ، ضمیر منصوب متصل بارہ، منفصل بارہ، اور ضمیر مجرور متصل بارہ، کل ساٹھ ضمیریں''۔

بابصیرت قارئین سے ہماری بھی گزارش ہے کہ وہ بتائیں کہ ڈاکٹر صاحب نے (ستون ضميرا) کی جو تشریح فرمائی ہے ''ضمیر مرفوع متصل بارہ الخ''، یہ ہماری تائید میں ہے یا تردید میں؟ کیونکہ موصوف نے اس کو ماضی کی قید کے بغیر مطلقا ذکر کیا ہے، جو اس بات پر دلیل ہے کہ ضمیر مرفوع متصل صرف ماضی میں منحصر نہیں ہے، یعنی ڈاکٹر صاحب نے اپنے (حصر) کی خود تردید کی ہے۔

دوسری صریح دلیل یہ ہے کہ صاحب ہدایۃ النحو (ستون ضمیرا) کے بعد فرماتے ہیں:

"واعلم أن المرفوع المتصل خاصة يكون مستترا فى الماضى للغائب، والغائبة ...... وفى المضارع المتكلم مطلقا"۔

یہ عبارت خود بول رہی ہے کہ مرفوع متصل صرف ماضی کے ساتھ خاص نہیں ہے اور نہ اسی میں منحصر ہے، اس لئے تفعلین اور افعلی، یا جن میں ضمیر مرفوع متصل بارز ہوتی ہے، وہ سب ان بارہ ضمیروں میں شامل ہیں، ان سے خارج نہیں ہیں کہ ان کو الگ سے بیان کیا جائے، ورنہ ان ضمیروں کی تعداد ساٹھ کے بجائے انسٹھ ہو جائے گی، اور فعل مضارع و فعل امر کی تمام ضمیریں خارج ہو جائیں گی۔

اب اس اعتراف کے ساتھ کہ راقم الحروف، ڈاکٹر موصوف کو سمجھانے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکے گا۔

☆☆☆

امام المناظرین مولانا عبدالرشید جھمکاوی
ابن مولانا مسلم صاحب مصنف دیوان گلشن ہدایت

(قسط:۵)

مولانا محمد حنیف مدنی/استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

آپ ہندوستان کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کئے جاتے تھے، آپ بہت بڑے جید عالم، بے باک خطیب اور زبردست مناظر تھے، آپ نے علمی دنیا میں چمپارن سے لیکر پورے ہندوستان میں اپنی تقریروں، تحریروں اور مناظروں کے ذریعہ دین کی دعوت کا نہایت ہی روشن کارنامہ انجام دیا ہے، جب جب فتنۂ قادیانیت اور عیسائیت نے ہندوستان کی سرزمین پر اسلام اور مسلمانوں کو مناظروں کے لئے چیلنج کیا تو آپ اس کے لئے تلوار بے نیام بن جاتے اور جواب دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے، غرض کہ آپ نے عیسائیوں، قادیانیوں، حنفیوں اور بریلوی عقائد کے علماء سے بھرپور مناظرہ کر کے انہیں شکست فاش دیا۔

آپ کی پیدائش ۱۲۵۵ھ کو افغانستان کے شہر کابل کے کالی پہاڑی مقام پر ہوئی، جہاں مسلم صاحب جہاد افغانستان میں شریک تھے، آپ مسلم صاحب کے سب سے بڑے فرزند تھے، آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالکریم صاحب مسلم سے حاصل کی، علاوہ ازیں آپ مولانا عبدالحئ صاحب لکھنوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب بقاغازی پوری کے شاگرد خاص تھے، میاں صاحب محدث دہلوی ؒ سے سند حدیث حاصل کی تھی۔

آپ نے سنت کے مطابق چار شادیاں کیں، ان چاروں عورتوں کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

۱-اُمت الحبیب قوم شیخ متوطن شہر دہلی۔

آپ جب دہلی میں علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی سے دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ان سے حدیث کی سند لی تو اسی دوران آپ کی شادی دہلی کے ایک رئیس کبیر شریف خاندان میں ہوئی، آپ کے خسر دہلی کے ایک جید عالم تھے، ان کا دورہ بھی خراسانی مجاہدین کی طرف سے چمپارن اور سارن میں ہوا کرتا تھا اور آپ بھی ان کے ساتھ دورے میں جایا کرتے تھے، اسی وجہ سے اپنی نیک دختر عالمہ کی شادی آپ سے کردی، جن کے بطن سے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

۱-مولانا ابوسعید صاحب ۲-مولانا ابوالبرکات صاحب ۳-مولانا ابوالخیر صاحب

اور ایک لڑکی سعیدہ خاتون۔

۲-کفیلن عرف کریمن بنت سید میر شجاعت حسین ساکن سنول۔

ان کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکے کا نام مولانا عبدالباری اور لڑکی کا نام رشیدہ ہے۔

۳-رئیسن عرف رحیمن بنت شیخ بندھو ساکن جھمکا۔

ان کے بطن سے تین لڑکے ہوئے۔

۱-نورغنی ۲-علی حسین ۳-نورالحسنین

۴-شریفن عرف سفیہن بنت میر زیاد علی ساکن سنول۔

ان کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مولانا سادات علی ہے۔

حاصل یہ کہ مولانا عبدالرشید صاحب ایک بلند پایہ عالم، بہترین واعظ اور زبردست مناظر تھے، آپ کی وفات ۱۹۲۰ء میں ہوئی، اور جھمکا میں مدفون ہیں۔

مناظر کے کچھ نمونے:

جب انگریزوں نے عیسائی مشنریوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا حربہ استعمال کیا تو ہندو سماج کے لوگ تو عیسائی بننے لگے، کیونکہ ان کو عیسائی ہونے سے روکنے کے لئے ابھی آریہ سماج کا جنم نہیں ہوا تھا، مگر مسلم علماء کرام نے عیسائیوں کے جواب میں جہادی قدم اٹھایا اور ہر ہر موڑ پر ان کا جواب دینا شروع کیا، چنانچہ بتیا مشن کے وسیلے سے بھی پادری مقرر اسلام پر دریدہ ذہنی سے بوچھار کرتے، بتیا کے شاہ اسحاق صاحب مختار کا خاندان کٹر اہل حدیث تھا، پادریوں کے ذریعہ اسلام وقرآن کے خلاف دھواں دھار تقریروں کو سن کر دم بخود ہو جاتے، اس وقت چمپارن کا کوئی عالم ان پادریوں کا جواب نہیں دیتا، کیونکہ چمپارن میں عالموں کی کمی تھی، مگر جب شاہ اسحاق صاحب کے والد محترم نے جھمکا میں حضرت مولانا عبدالرشید صاحب کو خبر دی تو مولانا موصوف چند شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ بتیا پہنچ کر پہلے ایک عالمانہ تقریر کی اور پادری عبدالحق جوالہ سنگھ کو مناظرے کے لئے چیلنج کیا، مناظرہ میں عبدالحق جوالہ سنگھ لاجواب ہو کر دہلی پھر لاہور پہنچا اور اسلام پر بوچھار شروع کی، حضرت مولانا ابوسعید صاحب صاحبزادہ مولانا عبدالرشید صاحب زیر تعلیم تھے، انہوں نے وہاں بھی اس کا دنداں شکن جواب دیا، حضرت مولانا عبدالرشید صاحب جھمکاوی نے اسی سلسلے میں ردعیسائیت پر ایک رسالہ ''نیّر اعظم'' لکھا جو تھانہ میناٹانڈ کے موضع گھورپکڑی کے حاجی دلاور صاحب کے اہتمام سے چھپا، یہ کتاب زیادہ موٹی ہے اور ناپید ہے۔

آپ کے مناظرہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، آپ نے ہر فرقہ ہر مذہب کے علماء سے مناظرہ کیا ہے، چنانچہ ضلع چمپارن کے مشہور ومعروف شہر بتیا میں اہل حدیث اور احناف کے درمیان آمین بالجہر، رفع الیدین اور سورہ فاتحہ خلف الامام کے متعلق دوسرا بہت بڑا مناظرہ طے پایا، اور مناظرہ کی تاریخ ودن طے ہوگیا، ہر فریق کے لوگوں نے مناظرہ میں شمولیت اختیار کی اور اس مناظرہ میں لوگوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی، اور مناظرہ کی جگہ کے لئے مناسب جگہ تلاش کی گئی، دونوں فریق کے لوگوں نے مشورہ کیا کہ یہ مناظرہ بتیا شہر کے رمنہ میدان میں کرایا جائے، تو تمام لوگ اس مشورہ پر متفق ہوگئے، جس میں احناف کے ہزاروں علماء موجود تھے، اور اس میدان مناظرہ میں اہل حدیث کے جید جید علماء کرام اور بہت بڑے بڑے اکابرین موجود تھے، اور آپ کو اپنے وطن جھمکا سے میدان مناظرہ میں مدعو کیا گیا، اور آپ میدان مناظرہ میں تشریف لائے اور جب میدان مناظرہ میں دونوں فریق کے علماء آمنے سامنے ہوئے تو حنفی علماء پر بدحواسی طاری ہوگئی کہ یہ بہت بڑا المبا قد والا انگریز انسان کہاں سے آگیا؟ شاید یہ لوگ مولانا عبدالرشید صاحب کو آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے، اور مناظرہ شروع ہونے سے قبل آپ نے حنفی علماء کو مناظرہ سے آگاہ کردیا تھا کہ دلیل قرآن وحدیث سے ہونی چاہئے نہ کہ قول امام سے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے ۔

قول نبی چھوڑ کر لیتا ہے جو قول امام
وہ نبی کے ساتھ چلتا ہے بغاوت کی روش

اور مناظرہ شروع ہوگیا، اور آپ پر ہر طرف سے حنفی علماء کے سوالات کی بھرمار تھی، آپ نے ان کے ہر ہر سوال کا جواب قرآن وحدیث سے دینا شروع کیا، یہ لوگ اس مناظرہ میں فرار کی راہ اختیار کرنے لگے جس میں علماء احناف کے جید نامی علماء کرام یکے بعد دیگرے بدلتے رہے۔ مناظرہ کے آخری ایام میں تمام حنفی علماء بری طرح شکست فاش سے دوچار ہوئے۔ اس کے متعلق آپ نے ایک کتاب ''جدال بتیا'' لکھا، یہ کتاب موضع جھمکا تھانہ سکٹا کے ایک بہت بڑے رئیس اعظم جناب شیخ فرزند علی صاحب کے اہتمام سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی، یہ کتاب بھی بہت موٹی ہے اور ناپید ہے۔

اور اس کے علاوہ آپ نے سناتن دھرم کے عالموں اور درویشوں اور صوفیاء کرام سے بھی زبردست مناظرہ کرکے انہیں میدان مناظرہ میں بری طرح لاجواب کیا، درویشوں اور صوفیاء کرام کے حالات پر آپ نے ''تحفۂ رشیدیہ'' لکھا، اس کتاب کا قلمی نسخہ آپ کے فرزند مولانا عبدالباری صاحب کے پاس موجود ہے اور ان کے علاوہ آپ کے پاس بہت زیادہ تصانیف ہیں، افسوس کہ ان کی تصانیف شائع نہ ہوسکی اور بعض کتابیں ضائع ہوگئیں، بعض تصانیف آگ میں جل کر راکھ ہوگئیں۔

مرجع ومصدر:
۱- مذکرہ، ڈاکٹر عبدالماجد صاحب ۲- تاریخ جھمکا از فراق الاعظم جھمکاوی ☆☆

اسلامی نظام اقتصاد اور عالمی مہنگائی

ڈاکٹر رحمت اللہ محمد موسی السّلفی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مذہب اسلام گونا گوں خصوصیات ومحاسن کا حامل مذہب ہے، عقیدہ واعمال، اخلاق وسلوک سے متعلق جتنے اصول وضوابط مذہب اسلام نے پیش کئے وہ بے بدل وبے مثل اور عادلانہ ومنصفانہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات وتقاضے کے بالکل موافق وہم آہنگ ہیں، ان میں فرد وسماج، زمان ومکان سب کی رعایت کی گئی ہے، وہ انسانوں کو باہم مربوط ومتحد رکھنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، مذہب اسلام کا نظریہ اقتصاد بھی نہایت خوب وجامع اور عادلانہ ومنصفانہ اور مساویانہ ہے، وہ اگر انسان کو اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہونے کی ترغیب دیتا ہے تو مختلف وسائل اقتصاد کو اپنانے اور اختیار کرنے کی تاکید بھی کرتا ہے اور سعی پیہم وجہد مسلسل کرنے کی تلقین کرنے کے ساتھ سستی وکاہلی کی یکسر مخالفت کرتا ہے، محنت ومشقت ومسلسل تگ ودو کرنے پر کامیابی کی ضمانت دیتا ہے، ﴿وأن ليس للانسان الا ما سعى وان سعيه سوف يرى﴾۔ (النجم: ۳۹، ۴۰) محنت وجانفشانی سے کام لے چاہے تجارت کے میدان میں ہو یا زراعت کے میدان میں یا صنعت وحرفت کے میدان میں، اور جب اکتساب معاش کے لئے مذکورہ میدان میں سے کسی ایک میدان کو اختیار کرے تو ضابطہ کے تحت اپنے کاروبار کو آگے بڑھائے اور بے ضابطگی سے بالکل کوسوں دور رہے، اس لئے کہ ضابطہ ہی انسان کو باضابطہ بناتا ہے، اگر انسان باضابطہ ہوگا تو اس کی تجارت باضابطہ ہوگی، زراعت باضابطہ ہوگی، صنعت وحرفت باضابطہ ہوگی، بے ضابطگی دنیا کی کسی چیز میں اللہ کو پسند وبرداشت نہیں، زمین وآسمان، بحروبر، شمس وقمر ہر چیز میں ضابطگی ہے، اسی ضابطہ وبندش کی وجہ سے دنیا کا نظام قائم ہے تو اگر کوئی انسان تجارت وزراعت یا کسی اور میدان کو اختیار کرے تو ضابطہ کے تحت کاروبار اور عمل کرنا ہوگا، آج اسی نکتہ پر عالمی نظامہائے اقتصاد اور اسلامی اقتصاد میں فرق نظر آرہا ہے، مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں اگر انسان کو اکتساب معاش کرنے اور تجارت وزراعت وصنعت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہے تو اس کو اس بات کی بھی آزادی ہے کہ اپنی دولت چاہے جس طرح ہو سکے اس میں اضافہ کرے، اس کے لئے کوئی ضابطہ وبندش نہیں، بس مال ودولت میں اضافہ ہونا چاہئے، کاروبار وتجارت سے ہو یا لوٹ کھسوٹ وچوری وچھین جھپٹ سے، حرام طریقے سے ہو یا حلال طریقے سے، تجارت حرام مال کی کرے یا حلال مال کی اگر حلال مال کی کرے تو بیع وشرا کے لئے کوئی ضابطہ نہ

ہو، بس مطمح نظر صرف یہ ہو کہ دولت یکجا کی جائے۔

مذہب اسلام صرف اکتساب معاش کی ترغیب ہی نہیں دیتا اور اس کے ضابطہ وقوانین ہی بیان نہیں کرتا، وہ یہ بھی نظام پیش کرتا ہے کہ جب جدوجہد کر کے تجارت وزراعت کر کے مال وزر اکٹھا ہو جائے تو یہ مت سمجھو کہ بس کام بن گیا اور کام ختم، نہیں نہیں، اس کے بعد مذہب اسلام ضابطہ کے تحت مال رکھنے، خرچ کرنے، تحفہ وتحائف وعطیات دینے، فقراء ومساکین میں تقسیم کرنے اور غریب ونادار کی خبرگیری کرنے، خویش واقارب کی زبوں حالی دور کرنے کی راہ میں دولت صرف کرنے کی تلقین کرتا ہے: ﴿ان اله يأمر بالعدل والاحسان وايتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر﴾ (النحل:۹۰) ﴿وخذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم (التوبۃ:۱۰۳) ﴿وفى أموالهم حق للسائل والمحروم﴾ (الذاریات:۱۹) اس کے برخلاف اشتراکی نظام اقتصاد یہ ہے کہ دولت خوب اکٹھی کرو محنت ومشقت کر کے مالی پوزیشن کافی مضبوط کرو چاہے اس کے لئے جو بھی جتن کرنا پڑے، بس، یہ مت دیکھو کہ ضابطہ کے تحت آ رہا ہے یا بغیر ضابطہ کے اگر بندش وضابطہ کے مکر میں پڑو گے تو تم بہت پیچھے رہ جاؤ گے، زمانہ کے شانہ بشانہ چلو جیسے لوگ آوارہ وآزاد ہو کر اکتساب معاش کرتے ہیں ویسے تم بھی کرو یہی تمہاری عقلمندی ہے اور سنو جب مال اکٹھا کر لو تو اسے نہ تم من چاہا استعمال کر سکتے ہو، خرچ کر سکتے ہو، اور نہ رکھ سکتے ہو، وہ مال جو تم نے بڑی محنت وجدوجہد کر کے کمایا ہے، اسے غریبوں میں تقسیم کرو، بیت المال کے حوالہ کرو، جہاں سے غریب ونادار لوگوں کو تقسیم کیا جائے گا تم صرف کھانے کے لئے اور پہننے کے لئے معمولی مقدار میں رکھو، سبحان اللہ، کتنا بڑا ظلم وناانصافی ہے کہ آدمی دولت تو کمائے لیکن اس میں تصرف کا اختیار نہ رکھے، مذہب اسلام کہتا ہے کہ دولت کمانے کے جو ضابطے ہیں ان ضابطوں کی پاسداری کر کے دولت اکٹھی کرو اور جب تمہارے پاس دولت آ جائے تو اسے ضابطے کے ساتھ رکھو، تمہیں رکھنے کی اجازت ہے اس میں سے ضرورت بھر کھاؤ پیو اور پہنو اور رہائش پر خرچ کرو، ساتھ ہی جو محتاج لوگ وضرورت مند ہیں ان میں تقسیم کیا کرو، زکاۃ نکالا کرو، اس سے ان کی ضرورت پوری ہوگی، دیگر اور سماجی کام پر بھی خرچ کرو، مال تمہارا ہے، اس میں سے خرچ وتصرف کرنے کی اجازت ہے، تحفے وتحائف وعطیات دینے کی بھی اجازت ہے، حبس وقف کی شکل میں مدارس ومساجد میں دینے کی چھوٹ ہے اس میں تم آزاد ہو، ضابطہ کے تحت پوری آزادی سے سرمایہ کاری کرو، زراعت وتجارت یا صنعت وحرفت کے میدان میں جو میدان چاہو اختیار کرو اور جب دولت کما لو تو اپنے اوپر خویش واقارب اور والدین پر خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ فقراء ومساکین پر خرچ کرو، اس سے سماجی تانا بانا مضبوط ومستحکم ہوگا، مساوات وخیر سگالی قائم ہوگی، لوگ تعاونوا على البر والتقوى (المائدۃ:۲) کے مصداق ہوں گے اور المؤمن للمؤمنين كالبنيان يشد بعضه بعضا (صحیح بخاری، الادب ۱۰/۵۰ مع الفتح وصحیح مسلم، البر والصلۃ ۱۶/۱۳۹ مع

النووی) کی عملی تعبیر وتصویر بنیں گے۔

آج مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشترا کی نظام اقتصاد کی پہلی پکار یہی ہے کہ انسانی سماج میں بھائی چارہ ہو، میل ملاپ ہو، آپسی محبت والفت ہو، ایک دوسرے کا ہمدرد وغم خوار وغمگسار بنے، مصیبت کے وقت کام آئے، غریب ونادار کی مدد کرے، نعرہ تو بہت عمدہ ہے لیکن کیا ان نظام اقتصاد کے علمبرداروں نے کبھی یہ سوچا کہ ہم نے جو ضابطہ اقتصاد اور فارمولہ معیشت دنیا والوں کے لئے پیش کیا ہے وہ مفید وجامع ہے؟ قطعاً نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اقتصادی نظام کے تعلق سے ہنگامۂ محشر بپا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے جو مالدار طبقہ تھا مزید مالدار وصاحب ثروت ہوا جارہا ہے، عالمی اقتصادیات پر مخصوص قسم کے لوگوں کی اجارہ داری ہے اور جو غریب ہیں آئے دن خستہ حالی کے شکار ہوتے چلے جارہے ہیں، رشوت وسود اور کالا بازاری کی وجہ سے امیر ترین ہورہا ہے اور غریب مفلس وقلاش ہوا جاتا ہے، اشترا کی نظام (کمیونسٹ نظام) کی وجہ سے سماج میں سرمایہ کاری کرنے والا خوف ودہشت کی وجہ سے سرمایہ کاری سے گریز کررہا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ محنت ومشقت کرکے جب ہمارے پاس دولت اکٹھی ہوگی تو اس پر ہمارا کوئی اختیار نہ ہوگا، اسے حکومت کے حوالہ کرنا ہوگا، بس گذر معاش کے لئے دوروٹی اور ایک کپڑا کے برابر مال رکھنے کی اجازت ہوگی، جب ایسی بات ہے تو ہم تجارت وزراعت کے میدان میں سرمایہ کاری کیوں کریں، ہر مال دار وزمیندار اسی سوچ میں مبتلا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ پورا سماج افراتفری وبھوک مری کا شکار ہے، غربت وافلاس کی ایسی شدید مار ہے کہ غریب تو غریب ہے مالدار بھی غریب ہوا چاہتا ہے۔

دنیا کے نقشہ پر غور کریں تو ہماری بات صد فیصد نظر آئیں گی، کمیونسٹ نظام اقتصاد کے تاروپود تو بکھر چکے ہیں، مغربی سرمایہ داری کا یہ حال ہے کہ آج پوری دنیا میں مہنگائی عام ہے، ہر کس وناکس کی زبان پر بس ایک ہی بات ہے ’’کمر توڑ مہنگائی‘‘ نے بین الاقوامی شکل اختیار کرلی ہے، عالمی قائدین وسیاست داں وماہرین اقتصادیات اس کے وجوہ واسباب تلاشنے پر جٹ گئے ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ، کوئی بسیار خوری کو وجہ بتاتا ہے جیسا کہ جارج بش نے ہندوستان کے 35 کروڑ خوشحال متوسط طبقہ کے لوگوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ یہ بسیار خوری کے شکار ہیں، اسی لئے دنیا میں مہنگائی بڑھ گئی، گویا کہ ان کی نگاہ میں یہ لوگ پیٹو ہیں، کچھ روز قبل امریکی وزیر خارجہ کنڈ ولیزا رائس نے بھی ہندوستان اور چین کے متوسط شہریوں کی خوراک کو مہنگائی کا سبب بتایا تھا، لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ سب بکواس ہے، مغربی سرمایہ دارانہ نظام اقتصاد کی دین ہے کہ آج عالمی پیمانہ پر مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے، ذخیرہ اندوزی ہی اس کی بنیادی وجہ ہے، اس نظام میں ذخیرہ اندوزی کے تعلق سے کوئی ضابطہ نہیں، اگر کوئی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تو اس پر کوئی روک نہیں، چاہے غذائی اشیا کی کرے یا کسی اور چیز کی کرے، اسے مکمل آزادی ہے، علاقائی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر، ہر سطح پر ذخیرہ اندوزی کرنے کی اجازت ہے، مالدار طبقہ غذائی اجناس کی

ذخیرہ اندوزی کر کے مہنگائی میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں، مذہب اسلام نے مہنگائی کا علاج بہت پہلے کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: لا یحتکر الا خاطیء (مسلم، البیوع ۱۱؍۳۴۳) ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار رہے۔ ذخیرہ اندوزی سے غذائی اجناس تک محتاج لوگوں کی رسائی نہیں ہوگی، ضرورت پڑنے پر وہ زیادہ قیمت دے کر خریدتے ہیں، قیمت کی ادائیگی نہ کر پانے کے خوف سے وہ لوٹ پاٹ بھی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے سماج میں امن وامان ختم ہو جاتا ہے، اسی خطرے کے پیش نظر مذہب اسلام نے ذخیرہ اندوزی سے منع کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور ضرورت مندوں کی ضروریات کو پوری کرتا ہے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ (دیکھئے شرح مسلم: ۱؍۴۳۳ نووی) اہل مغرب کے یہاں احتکار وذخیرہ اندوزی کرنے والا قطعا یہ نہیں سوچتا، ان کی سوچ تو یہ ہے کہ کیسے دولت اکٹھی کی جائے اور کیسے مہنگی قیمت پر بیچی جائے، بس اور کچھ نہیں، عالمی مہنگائی کی بنیادی وجہ میری سمجھ میں احتکار وذخیرہ اندوزی ہے، ورنہ اگر آج عالمی پیمانہ پر سرمایہ دار احتکار بند کر دیں تو مہنگائی ختم ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔

دوسری وجہ جو ذخیرہ اندوزی ہی سے منسلک ہے وہ یہ کہ امریکہ خوب جان رہا ہے، عالمی اقتصاد کی کنجی اس کے پاس نہیں، پٹرول وگیس یہ دونوں اس کے پاس نہیں یا تو عرب ممالک کے پاس ہے یا کسی تیسرے ملک کے پاس ہے، امریکہ کا ہاتھ خالی ہے، اندر ہی اندر وہ اس سوچ میں پڑا ہے کہ ایندھن کے معاملہ میں ہمارے یہاں جو کمی ہے اس کو کیسے دور کیا جائے اگر خدانخواستہ عربوں نے قدرتی ایندھن (پٹرول وغیرہ) پر پابندی لگا دی تو ہمارا کیا ہوگا، اسی فکر میں انہوں نے حیاتی ایندھن تیار کرنے کی سوچی ہے، اسی لئے امریکہ کی کمپنیاں بڑے پیمانے پر اناج کو حیاتی ایندھن میں تبدیل کر رہی ہیں اور پوری دنیا سے غذائی اجناس کا اکسپورٹ کیا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں غذائی اجناس میں کمی آ گئی ہے اور جب اجناس کی قلت ہوگئی تو لامحالہ قیمت میں اضافہ ہوگیا، گویا عالمی پیمانہ پر جو مہنگائی عام ہوئی ہے اور لوگوں کو بھوک وافلاس کی گود میں ڈھکیلا گیا ہے اس کی بنیادی وجہ مغربی سامراجیت ہے جو اپنی اقتصادی ومالی حالت سدھارنے کے لئے پوری دنیا پر ظلم وستم کر رہی ہے، اگر پوری انسانی آبادی کو مہنگائی اور دیگر اقتصادی مسائل سے نجات پانا ہے تو انہیں اسلامی نظام اقتصاد کو اپنانا ہوگا اور دیگر نظامہائے اقتصاد ومعاش سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، ساتھ ہی اہل مغرب وامریکہ کی غلط اقتصادی پالیسیوں سے چوکنا رہنا ہوگا۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں اسلامی معیشت کو اپنانے اور دنیا والوں کے سامنے اس کے بہترین نظام کو پیش کرنے کی توفیق ارزانی کرے، آمین۔

☆☆☆

اپنڈکس !عظمت مولی کی شہادت

محبوب عالم سمیع اللہ
مترجم شعبۂ توعیۃ الجالیات، دمام، سعودی عرب

(زیرنظر مکتوب دراصل رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے ہفتہ واری اخبار ''عالم اسلامی'' کے ایک کالم ''اعجاز علمی کے نمونے'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جس میں مترجم کی طرف سے معمولی اضافہ بھی شامل ہے۔ مترجم: محبوب عالم سمیع اللہ)

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ والتين والزيتون، وطور سينين، وهذا البلد الأمين، لقد خلقنا الانسان فى أحسن تقويم ﴾ ترجمہ: قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی! اور طور سینین کی! اور اس امن والے شہر کی! یقیناً ہم نے انسانوں کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورہ التین: ۱-۴) اللہ تعالی نے انجیر اور زیتون کے درختوں کی، نیز سینا کے جبل طور کی، مکہ مکرمہ کی قسمیں کھا کر ایک بہت بڑی بات کی تاکید فرمائی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو بڑی ہی بہترین تخلیق بخشی ہے (جیسا کہ مجاہدؒ کا قول ہے) اور خوب سے خوب تر شکل وصورت سے نوازا ہے (جیسا کہ قتادہؒ اور کلبیؒ نے ذکر کیا ہے) چونکہ اللہ تعالی ہر چیز کو نہایت ہی محکم انداز سے پیدا فرماتا ہے، لہذا کسی طور پر بھی یہ ممکن نہیں کہ اس کی تخلیق میں کسی طرح کی کوئی کمی یا زیادتی ہو، اس میں کوئی فضول، بیکار اور بے فائدہ چیز پائی جائے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿انا كل شيء خلقناه بقدر ﴾ ترجمہ: بیشک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے۔ (سورہ القمر: ۴۹)

قارئین کرام! سطور بالا پر مشتمل مختصر سا مقدمہ دراصل ایک حیرت انگیز انکشاف عرض کرنے سے قبل بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے، مختلف ذرائع ابلاغ نے اس موضوع کی نشر واشاعت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت اختیار کرتے ہوئے اپنے فرنٹ پیج پر جگہ دی ہے، وہ انکشاف یہ ہے کہ انسان کے پیٹ میں پایا جانے والا بارہ انگشتی آنت جسے زائدہ یا اپنڈکس کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے بارے میں عرصۂ دراز سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ایک تخلیقی غلطی (پروڈکشن فالٹ) اور انسان کے جسم میں پایا جانے والا ایک زائد اور بیکار عضو ہے، انسان کے بدن میں اس کی کوئی ضرورت اور کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر دور

حاضر کے سائنسدانوں کے سامنے یہ بات بالکل واضح اور ظاہر ہوچکی ہے کہ جسم انسان کے اندر اس کے فوائد بے شمار اور بڑے ہی اہم اور زبردست ہیں۔

چند ایام قبل ایک امریکن میڈیکل ٹیم نے اعتراف کیا ہے کہ اپنڈکس کے حقیقی رول اور کردار کا ایسا زبردست انکشاف ہوا ہے جس نے سائنسدانوں کو حیران کر کے رکھ دیا ہے، دراصل یہ عضو ایسے مختلف الانواع جراثیم اور بکٹیریا پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے جو انسانی معدے کے اندر نہایت ہی مفید اور اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اسی دوران ایک امریکن یونیورسٹی ڈیوک کے ماتحتی میں کام کرنے والی ایک ٹیم نے توجہ دلائی ہے کہ شاید اب اس انکشاف کے ذریعہ اپنڈکس کے مفروضہ کرداروں کے بارے میں پائے جانے والے جھگڑے کا خاتمہ ہو جائے، بعد اس کے کہ قدیم طبی نظریوں کے حاملین نے اسے طویل عرصے تک ایک ایسا عضو معطل اعتبار کررکھا تھا، جس نے اپنا سارا کردار ساری اہمیت انسانی ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے انسان کے موجودہ شکل اختیار کرنے کے ساتھ ہی کھو دیا تھا، ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اب کسی منفی ردعمل کے بغیر اس عضو کا زائل کردینا ممکن ہو چکا ہے (چنانچہ اپنڈکس نظریہ ارتقاء وتطور کے موہوم ادلہ میں سے ایک اہم دلیل شمار کیا جاتا تھا، مگر اب تو جادو کے زد میں الٹا جادوگر ہی آ گیا، اور یہی اپنڈکس اب اس بات کی قوی دلیل بن گیا کہ اللہ کی تخلیق بڑے ہی بہترین اور محکم اندازے پر مبنی ہے نیز ڈارون کی طرف منسوب فلسفۂ تطور وارتقاء اور اپنے آپ پیدا ہو جانے کے نظریے کی عمارت کو ڈھانے کا سب سے بڑا آلہ بن چکا ہے)۔

مذکورہ ٹیم کے ریسرچ کے مطابق جسے ''طب نظری'' نامی میگزین نے شائع کیا ہے، جسم انسانی کے اندر پائے جانے والے جراثیم اور بکٹیریاز کی تعداد انسان کے بدن میں پائے جانے والے سیلس کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے، ان باریک حیوانات کی ایک بڑی تعداد انسان کے بدن کے اندر بڑا ہی مثبت کردار ادا کرتے ہیں اور کھانوں کو ہضم کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

ریسرچ کے اندر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کالرا اور شدید اسہال جیسی بعض خاص بیماریوں کی حالت میں شدید امکان ہوتا ہے کہ معدہ اس طرح کے مفید جراثیم سے خالی ہو جائے، ایسے حالات میں اپنڈکس کا کردار شروع ہوتا ہے جس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان مشکل حالات میں ایسے جراثیم کاری پروڈکشن کرے نیز ان کی پہرہ داری اور حفاظت کے فرائض بھی انجام دے۔

اپنے اس نظریہ کو مزید تقویت دینے کے لئے ریسرچ میں جس بات کا اعتبار کیا گیا ہے وہ اس کا محل وقوع ہے کہ

اپنڈکس موٹی آنت کے بالکل نیچے کی جانب واقع ہے جوکھانے کا یک رخی راستہ اعتبار کیا جاتا ہے،اور یہی اس دعوی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ہم اس ملحد اور دہریہ سے پوچھنا چاہتے ہیں جو اپنے کفر والحاد پر نازاں دکھائی دیتا ہے کہ آخر وہ کون سی ذات ہے جس نے ان خلیوں کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ اسٹور روم کی حیثیت رکھنے والے ایک چھوٹے سے عضو میں ان مفید جراثیم کو محفوظ کر کے رکھے،اور جیسے ہی ان کی تعداد ضروری مقدار سے کم ہو تو فوری طور پر ان کی تعویض کی جا سکے؟ کیا اس باریک نظام کا اپنے آپ ہی بلا کسی سابقہ منصوبہ بندی کے واقع ہونا ممکن ہے؟ کیا سیلس کو ان مفید جراثیم کی اہمیت پہلے سے معلوم تھی کہ وہ تاوقت ضرورت انہیں اسٹور کر کے رکھتے ہیں؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ماضی قریب تک اپنے تمام مشینی وسائل،سائنس اور ٹکنالوجی کے باوجو اس عضو (اپنڈکس) اوراس کے اندر موجود جراثیم کے فوائد کا بالکل کوئی علم نہ تھا۔

یا اس کے پیچھے کوئی عظیم (الہی) قدرت کارفرما ہے جو نہایت بہترین اندازے کے مطابق ان خلیوں کو منظّم کرتی ہے تاکہ وہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کر سکیں؟ یقیناً اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس کے پیچھے اللہ تبارک وتعالی کی ذات لاشریک ہے،جس کا ہمارے اوپر یہ واجبی حق ہے کہ ہم اس کی تخلیق میں تدبر اور غور وفکر کریں،ہم پر اس کے فضل واحسان کی عظمت واجلال کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد وثنا بیان کریں،اس کے لئے خشوع وخضوع اور تذلل کا اظہار کریں،اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں کہ اس نے ہمیں اتنا متناسب اور خوبصورت جسم عطا فرمایا،رب ذوالجلال کے علاوہ کسی کے اندر بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کی مخلوقات جیسی کوئی مخلوق پیدا کر سکے،کسی بھی اعتبار سے،نہ مادی نہ معنوی۔

اسی لئے اللہ تعالی نے ہمیں اپنے آپ میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وفی أنفسکم أفلا تبصرون ﴾ ترجمہ: اور خود تمہاری ذات میں بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔(سورہ ذاریات:۲۱) نیز ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ الذین یذکرون الله قیاما وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرون فی خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانك فقنا عذاب النار ﴾ ترجمہ: جو اللہ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں،اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا،تو پاک ہے،پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔(آل عمران:۱۹۱)

(ماخوذ از: اخبار ''العالم الاسلامی'' رابطہ عالم اسلامی،مکہ مکرمہ،عدد:۲۰۰۹،دوشنبہ ۷ /جنوری ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

اخبار جامعہ

مرکز السلام التعلیمی جھارکھنڈ کے''دورۂ تدریبیہ للائمۃ والدعاۃ''

میں جامعہ کے وفد کی شرکت

مرکز السلام التعلیمی، صاحب گنج، جھارکھنڈ کی دعوت پر جامعہ سلفیہ کا ایک سہ رکنی وفد مرکز کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ائمہ ودعاۃ کے ہفت روزہ تربیتی پروگرام (یکم تا ۷رجون ۲۰۰۸ء) میں شریک ہوا، یہ وفد صدر جامعہ ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، استاذ جامعہ مولانا عبدالوہاب حجازی اور استاذ جامعہ اسعد اعظمی پر مشتمل تھا۔ دورہ میں شرکت کے لئے محترم ناظم اعلی مولانا عبداللہ سعود صاحب سلفی حفظہ اللہ بھی مدعو تھے، موصوف اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے پروگرام میں شریک نہیں ہوسکے، البتہ آپ نے دورہ کی کامیابی کی تمنا اور دعاء پر مشتمل اپنا پیغام ذمہ داران مرکز کو بھجوایا تھا۔

ذمہ داران مرکز نے محترم ڈاکٹر ازہری صاحب کو اس دورۂ تدریبیہ کا صدر منتخب کیا تھا، وفد کے ارکان نے اس ہفت روزہ پروگرام میں بھرپور علمی شرکت کی اور شرکاء کو اپنے محاضرات وخطابات سے مستفید فرمایا، جس کی تفصیل اس طرح ہے:

۱-ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

☆ رئیس الدورۃ، افتتاحی واختتامی نشستوں کی صدارت
☆ محاضرہ (۱) بعنوان: عربی زبان کے عدم فروغ سے دینی وملی زوال
(۲) بعنوان: دعوتی میدان میں سلفی علماء کا منہج واسلوب
☆ معلمات وطالبات سے خطاب
☆ فضلاء جامعہ سلفیہ کے ساتھ خصوصی نشست اور توجیہی خطاب
☆ پروگرام کی مختلف نشستوں میں مفید تعلیقات واضافات

۲-مولانا عبدالوہاب حجازی

☆ پروگرام کی ایک نشست کی صدارت
☆ محاضرہ (۱) بعنوان: ائمہ ودعاۃ کے اوصاف (۲) بعنوان: نماز میں سرقہ کا مفہوم

۳-مولانا اسعد اعظمی

☆ پروگرام کی ایک نشست کی صدارت
☆ محاضرہ (۱) بعنوان: عہدہ اور منصب کا اسلامی تصور (۲) بعنوان: اعتدال فی الصلاۃ
☆ خطبۂ جمعہ جامع مسجد چاندپور
☆ اتباع سنت کے موضوع پر ایک تعلیق

اس پروگرام سے مستفید ہونے والے مرکز کے دعاۃ، ائمہ، مدرسین، معلمات کے علاوہ مرکز کے طلبہ، طالبات اور قرب وجوار کے علاقوں سے معتد بہ تعداد میں علماء کرام تھے۔

یہ ادارہ جامعہ سلفیہ کے فارغ التحصیل شیخ عقیل اختر یوسف سلفی مکی نے گمانی برہروا کے اندر ۱۹۹۳ء میں قائم کیا ہے اور اس مختصر مدت میں اللہ کی توفیق اور بانی کے خلوص اور جدوجہد سے اس ادارہ نے کافی ترقی کی ہے۔ ☆☆☆

باب الفتاوی

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کے بارے میں:

سوال (۱) کیا کسی میت کو دفن کردینے کے بعد قبر سے نکالا جاسکتا ہے؟

الجواب بعون اللہ الوھاب:

(۱) کسی شرعی ضرورت کے پیش نظر میت کو میت کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قبر سے نکالا جاسکتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے والد کے ساتھ قبر میں ایک اور شخص دفن تھے، لیکن میرا دل اس پر راضی نہیں ہورہا تھا، اس لئے میں نے ان کی لاش نکال کر دوسری قبر میں دفن کردی۔ (صحیح بخاری: ۱۳۵۲، نسائی ۸۴/۴)

اسی طرح ایک روایت جو حضرت جابرؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین کی وفات کی خبر سن کر تشریف لائے تو عبداللہ بن ابی کو اس کی قبر میں ڈالا جاچکا تھا، لیکن آپ ﷺ کے حکم سے اسے قبر سے نکال لیا گیا، پھر آپ ﷺ نے اسے اپنے گھٹنوں پر لیکر لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور اپنا کرتۂ مبارک اسے پہنا دیا، اب اللہ تعالی ہی اس کی وجہ بہتر جانتا ہے۔ (غالبا مرنے کے بعد منافق کے سردار کے ساتھ ایسے سلوک کی وجہ یہ تھی کہ) اس نے عم رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ایک قمیص پہنائی تھی، الفاظ حدیث یوں ہیں: قال عمرو سمعت جابر بن عبد اللهؓ قال: أتى رسول الله ﷺ عبد الله بن أبى بعد ما أدخل حفرته فأمر به فأخرج فوضعه على ركبتيه ونفث عليه من ريقه والبسه قميصه، فالله أعلم وكان كسا عباسا قميصا ...... الخ"۔ (صحیح بخاری: ۱۳۵۰، کتاب الجنائز: باب ھل یخرج المیت من القبر واللحد لعلۃ)

علامہ شوکانی رحمہ اللہ بھی اس عمل کے جواز کے قائل ہیں۔ (نیل الاوطار ۶۵/۳)

حضرت العلام محمد ناصر الدین البانیؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ (احکام الجنائز)

سوال (۲) کسی میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرکے دفن کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب (۲) عہد نبوی اور عہد صحابہ میں عملی سنت یہی رہی ہے کہ وفات پانے والے مردوں کو اسی شہر میں دفن کیا جاتا رہا ہے، جہاں ان کی وفات ہوئی اور شہداء کو بھی وہیں دفن کیا جاتا رہا ہے، جہاں انہوں نے شہادت پائی، نیز کسی صحیح حدیث یا اثر سے یہ

بات ثابت نہیں کہ کسی بھی صحابی کو اس شہر کے قبرستان کے علاوہ جہاں اس کی وفات ہوئی، کسی اور شہر یا اس کے مضافات یا اس کے قریب کسی اور جگہ دفن کیا گیا ہو، اسی وجہ سے جمہور علماء وفقہاء یہ جائز نہیں مانتے کہ کسی صحیح غرض یا کسی شرعی عذر کے بغیر میت کو دفن کرنے کے لئے اس شہر کے علاوہ جہاں اس کی وفات ہوئی ہو، کسی اور شہر میں دفن کیا جائے۔ غرض صحیح یا شرعی ضرورت یہ ہے کہ اگر میت کو اس شہر میں دفن کیا جائے تو کسی دشمنی اور لڑائی جھگڑے وغیرہ کی وجہ سے اس کی قبر کی بے حرمتی اور توہین کئے جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں واجب ہے کہ اسے کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں اس طرح کا کوئی ڈر نہ ہو یا اسے اس کے اپنے شہر میں اس لئے منتقل کیا جا سکتا ہے تا کہ اس کے اہل خانہ بھی بآسانی اس کی قبر کے پاس جا سکیں یا اس طرح کی اور کوئی ضرورت ہو تو میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس طرح کے جواز کی صورتوں کے باوجود یہ شرط ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہو کہ میت میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جائے یا اس کی بے حرمتی کا اندیشہ ہو، اگر اس طرح کا کوئی حقیقی سبب موجود نہ ہو یا یہ شرطیں پوری نہ ہوتی ہوں تو پھر میت کو منتقل کرنا جائز نہیں۔ (تفصیل: فتاوی اسلامیہ ۲/۵۵، ۵۶، فقہ الحدیث: کتاب الجنائز: ۱/۶۴۵ میں دیکھی جا سکتی ہے)

سوال (۳) میت کو رات میں دفن کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب (۳) صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ میت کو رات کے وقت دفن کرنا بھی جائز ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انسان فوت ہو گیا جس کی نبی کریم ﷺ بھی عیادت کیا کرتے تھے، اس کا انتقال رات کو ہوا اور رات ہی میں صحابہ کرام نے اسے دفن کر دیا، صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ کو اس کے بارے میں بتایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ما منعكم أن تعلموني" (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، ح: ۱۲۴۷) یعنی مجھے کیوں نہیں بتایا، صحابہ کرام نے عرض کیا ''رات کا وقت تھا، اندھیرا بھی تھا، ہم نے پسند نہیں کیا کہ آپ کو تکلیف دیں، تو آپ ﷺ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کا جنازہ پڑھا۔

اس حدیث پاک سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ اسے رات کے وقت کیوں دفن کیا گیا، ہاں البتہ آپ نے اس بات پر ضرور اعتراض فرمایا کہ آپ ﷺ کو رات کے وقت ہی کیوں نہیں بتایا گیا؟ جب اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عذر پیش کیا تو آپ نے ان کے عذر کو قبول فرمالیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس طرح بھی ہے کہ ''کچھ لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی تو اس کے پاس گئے، وہاں جا کر دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرما رہے ہیں: "ناولوني صاحبكم" (سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فی الدفن باللیل ح: ۳۱۶۴) یعنی کہ اپنا ساتھی مجھے پکڑاؤ۔

یہ وہ صحابی تھے جو بلند آواز سے ذکر کیا کرتے تھے اور یہ تدفین بھی رات کے وقت عمل میں آئی تھی جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ

کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی ......الخ۔

نبی کریم ﷺ کی تدفین بھی رات کے وقت عمل میں آئی تھی جیسا کہ امام احمد بن حنبل ؒ نے حضرت عائشہ ؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تدفین کا علم اس وقت ہوا جب ہم نے رات کے آخری پہر ''مساحی'' کی آواز سنی۔(مسند احمد: ۶/ ۶۲، ۲۴۲) اسی طرح حضرت ابوبکر (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، ح: ۱۳۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۳۴۶)، حضرت عثمان (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/ ۳۴۶)، حضرت عائشہ (اسد الغابۃ: ۵/ ۵۰۴، البدایۃ: ۸/ ۹۷)، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۳۴۶) کو بھی رات ہی کے وقت دفن کیا گیا تھا۔

اور یہ روایات (۱) حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لا تدفنوا أمواتكم بالليل الا أن تضطروا اليه"۔ یعنی اپنے مرنے والوں کو رات میں دفن نہ کروالا یہ کہ تم اس کے لئے مجبور ہو جاؤ۔ (صحیح ابن ماجہ: ۱۲۳۵، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الاوقات التی لایصلی فیھا علی المیت ولا یدفن، ابوداود: ۳۱۴۱، نسائی: ۴/ ۳۳)

(۲) صحیح مسلم (۹۴۳) کتاب الجنائز، باب فی تحسین کفن المیت میں ایک روایت ہے کہ ''آپ ﷺ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا ہے الا یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی گئی ہو۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دفن کرنا مکروہ ہے یا منع ہے، تو اس بارے میں واضح ہو کہ یہ حکم اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کسی کو کم حیثیت سمجھتے ہوئے جلد بازی کے ساتھ راتوں رات دفن کر دیا جائے اور اس کی خبر لوگوں کو نہ کہا جائے تا کہ دفن میں کم لوگ شریک ہوں، یا اس طرح کی کوئی بھی بات ہو جس سے میت کی تذلیل و تحقیر ہوتی ہو اس کو چھپانے کے لئے رات کو دفن کرنا منع ہے، یا ممانعت کی روایات کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ افضل یہ ہے کہ دن کے وقت دفن کیا جائے تا کہ نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمان شریک ہوسکیں، جنازہ کے ساتھ جانے والوں، تدفین میں شرکت کرنے والوں اور سنت کے مطابق لحد بنانے والوں کے لئے بھی اسی میں زیادہ سہولت ہے کہ تدفین کا عمل دن کے وقت سرانجام دیا جائے بشرطیکہ کوئی ایسی ضرورت نہ ہو جو جلد تدفین کی متقاضی ہو، لیکن یہ یاد رہے کہ زیادہ مناسب وواجب یہی بات ہے کہ تدفین میں جلدی کی جائے خواہ رات کا ہی وقت کیوں نہ ہو۔ (جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ نیل الاوطار: ۳/ ۳۸)

ہذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم
حررہ: ابوعفان نور الہدی عین الحق سلفی مالدہی
جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس

الجواب صحیح
محمد رئیس ندوی
جامعہ سلفیہ بنارس

☆☆☆